انتخاب زریں



سید راس مسعود المخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر

۷۸۶

تمہید

کِسی قوم کی تہذیب و تمدّن کے اندازہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے سرمایہ نظم کا مطالعہ کیا جائے۔

چند سالہائے گزشتہ سے میں یہ ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسا انتخاب شایع کروں جس پر ایک نظر ڈالنے سے میرے ہم وطن دوستوں کو اُردو نظم کے بہترین حصہ کا لطف حاصل ہو جائے۔

یہ مجموعہ "انتخابِ زرّیں" کے نام سے جو آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنّنِ طبع کا سبب ہوگا۔ بلکہ اُن لوگوں کو جو اُردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کر دے گا کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور ان کے

ملاحظہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ اگر اردو شاعری کے بہترین حصّہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی سے اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو اوّل الذکر کا درجہ گرا ہوا نہ رہے گا۔ درحقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہی کہ اُردو وہ زبان ہی جس کا شمار زمانۂ حال کی نوزائیدہ زبانوں میں ہی تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہی کہ اس قدر قلیل مُدّت میں اردو نظم کو وہ جِلا دے دی گئی جو مہذّب اور شُستہ خیالات کے لیئے اصل الاصول ہی۔

صرف ایک ذاتِ واحد کا کیا ہوا انتخاب اسی وقت ہر شخص کے مذاق کے مناسب ہو سکتا ہی جبکہ مولف کو قدرت سے ذہانت کا کافی حصہ ملا ہو (بدقسمتی سے میں اس سے کوسوں دور ہوں) جو اصول میں نے اس انتخاب میں مدنظر رکھا ہی وہ نہایت سادہ ہی۔ میں نہ شاعر ہوں نہ فن سخن کا نقاد و کامل لیکن مجھے اپنی قوم کے فن شعر کے ساتھ سچّا عشق ضرور ہی۔ میں نے وہی کلام انتخاب کیا ہی جس کو میرے دل نے پسند کیا۔ جن اشعار نے مجھ پر گہرا اثر کیا انھیں کو میں نے اس تذکرہ میں لیا ہی اور جن اشعار سے صرف عارضی اور فوری ولولہ پیدا ہوتا تھا اُن کو ترک کر دیا خلاصہ یہ کہ میرا قلب ہی اس معاملہ میں میرا رہنما تھا۔ پس اگر ناظرین کو اس انتخاب میں کوئی سُقم نظر آئے تو وہ اسے اُردو نظم کا نقص نہ خیال کریں بلکہ فی الواقع وہ اس کو میرے مذاق کی کمی سمجھیں۔

میں اس موقع پر اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ بالخصوص ان اصحاب کے لیئے مرتب کیا گیا ہی۔ جو میری طرح اس نئی روح پر

جو ہماری شاعری میں پھونکی جارہی ہی نگاہ رکھتے ہیں اور قدیم طرز کے خیالات کے شیدائی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ بہت سی مشہور غزلوں کو جن میں وہ نیالی مضامین نظم کیئے گئے ہیں جو ایک زمانے میں ہماری پرانی شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔ (لیکن افسوس اکہ موجودہ زمانہ میں اُن کا ہمارے جذبات پر کچھ اثر نہیں ہوتا) اس تذکرہ میں جگہ نہیں دی گئی ہی۔

اس وقت تک اُردو نظم کے جس قدر انتخابات میری نظر سے گزرے ہیں اُن سب میں میرے معزز دوست مسٹر الیاس برنی پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی کے انتخابات جو حال ہی میں شایع ہوئے ہیں بلاشبہ بہترین ہیں۔ اُنھوں نے ہر مضمون کی نظموں کو جُداگانہ حصوں میں ترتیب دینے کی جو تکلیف اُٹھائی ہی میں کافی طور سے اُس کی داد نہیں دے سکتا۔ اُن کی یہ کوشش جاری ہی اور وہ وقتاً فوقتاً اس کی اور جلدیں شایع کریں گے۔ اس کے مقابلہ میں اس مجموعہ کے پیش کرنے کے متعلق میری حقیر کوشش کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور نہ وہ آئندہ جاری رہنے والی ہی۔ میں نے شعرا کا مختصر حال اور اُن کا کلام اُن کے زمانے کی ترتیب کے لحاظ سے دیا ہی۔ یعنی متوفی شاعروں کو اُن کی سنِ وفات کی ترتیب سے اور اپنے زمانے کے زندہ شعرا کو اُن کی سالِ پیدائش کے لحاظ سے درج کیا ہی۔ اگر میرے وہ دوست جو مجھ سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں اس رسالہ کو مطالعہ کرنے کے بعد مجھ سے اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ واقف

ہو جائیں گے۔ تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت پورے طور سے وصول ہو گئی

خاکسار

سید ر۔ اس مسعود

حیدرآباد دکن

۶؍ اگست سنہ ۲۱ ۱۹ ء

انتخاب زرّیں

طبع سوم

سرسید راس مسعود بالقابہ نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں جبکہ
وہ سرکار آصفیہ میں ناظم تعلیمات کے فرائض ادا کر رہے تھے اُردو ادب کے
ان جواہر ریزوں کو ایک تاریخی سلسلہ میں منسلک کرکے ملک کے سامنے
پیش کیا تھا۔ ان کا یہ انتخاب فی الواقع انتخاب زریں ثابت ہوا۔ دنیائے
ادب نے اس کو نہایت عزت کی نظر سے دیکھا۔ آج اس کا یہ تیسرا نسخہ
ناظرین کرام کے ہاتھوں تک پہونچتا ہی۔ اس جدید الطبع نسخہ کی اشاعت
کے وقت اکثر شعرا جو طبع اول کے وقت زندہ تھے آج اس دار فانی سے
کوچ کر چکے ہیں لیکن اصل نسخہ میں ان کا کلام جس ترتیب سے دیا گیا ہی
وہی ترتیب اس نسخہ میں بھی قایم رکھی گئی ہی صرف ناظرین کی آگاہی کیلئے
میں نے شاعر متوفے کا سال رحلت لکھدیا ہی۔ اس بے مثل انتخاب کی مقبولیت

کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں ایسے اشعار کے انتخاب سے احتراز کیا گیا ہے کہ جو سنجیدگی اور متانت کے درجہ سے گرے ہوئے ہوں زہرِ عشق اور مثنوی طلسمِ الفت کے اشعار بھی اگر انتخاب ہوئے ہیں تو ان میں ہوسناکی کی داستان اور بازاری بولی ٹھولی کا پہلو نظر نہیں آتا۔

اس انتخاب کو مرتب ہوئے سولہ سال گزر چکے ہیں اس مدت میں اردو شاعری میں انقلابِ عظیم ہو چکا ہے اور اردو ادب نئے شاعروں کے کلام سے روشناس ہو چکا ہے مثلاً جوش ملیح آبادی اور جگر مرادآبادی کے کلام کا آج کل بہت کچھ چرچا ہے ناظرین انتخاب ہذا کے صفحات ان شعرا کے کلام سے خالی پائینگے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جس وقت یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا ان کے کلام کی وہ شہرت نہ ہوئی تھی جو آج ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر قوم کے اندر ایک روح ہوتی ہے اور ہر قوم کی فطرت ایک مخصوص قانون کی پابند ہوتی ہے جس سے اس کے ارتقا کی منزلوں کا تعین ہوتا ہے۔ شاعر اسی قومی ارتقا اور فطرت کے قوانین سے متاثر ہو کر قومی جذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اس اجمال کی تفصیل حضرت جوش ملیح آبادی کے نمونہ کلام سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

اُٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر — نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
نئے حصول جزا و سزا کی دے تعلیم — نیا تخیل روزِ شمار پیدا کر
غلط ہے سازِ عجم ہو کہ لحن اعرابی — نیا ترانہ سرِ شاخسار پیدا کر
بہت بلند ہے سطح مذاق فکر جدید — نظر میں اوجِ سپہر کوہسار پیدا کر
کلاہ خواجگی کامیاب کج کر کے — نیا زمانہ نیا روزگار پیدا کر
بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے — جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

مذاق بندگی عصر نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

جگر مراد آبادی کا رنگ اس سے بالکل مختلف ہے ان کی شاعری غزل ہی تک محدود ہے دیگر اصناف سخن میں انھوں نے شاذ و نادر ہی قدم رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ سیاسیات اور قومیات میں انکی نظموں کی تعداد بہت کم ہے اس لیے ہم شعلہ طور سے ان کی ایک غزل کا انتخاب اس موقع پر پیش کرتے ہیں۔

بے نقاب آج جو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے — جو جہاں پر ہو وہیں بیخود و حیراں ہو جائے
ایک ذرہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے — آدمی شدتِ انوار سے حیراں ہو جائے
حسن جب محو نگراں عشق جو حیراں ہو جائے — جان خود جسم بنے جسم اگر جاں ہو جائے
عشق ناکام ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی — یہی انساں کی ہے معراج جو انساں ہو جائے
خام سمجھو طلب و شوق کا اعجاز جگر — ہر نفس عشق نہ جب تک کہ رگِ جاں ہو جائے

اس تمہید میں ان دو نئے شاعروں کے کلام کا نمونہ پیش کرنے سے میری صرف یہ غرض ہے کہ ناظرین پر ظاہر ہو جائے کہ ہماری زبان کی شاعری ارتقا کی کس منزل میں ہے اور گزشتہ سولہ برس میں اس میں کیا کیا انقلاب رونما ہوئے ڈاکٹر اقبال و فانی وغیرہ کے کلام کے انتخابات جو انتخاب ربیں کے قابل ہوں نے اپنے تذکرہ کی پہلی ترتیب کے وقت زیب قلم فرمائے ہیں وہ بھی آج پرانے ہو چکے ہیں اگر ان شعرا کے تازہ کلام پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ فرق نمایاں نظر آئے گا جس سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کل ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں جو انقلابات ہو رہے ہیں ہماری شاعری بھی اس سے متاثر نظر آتی ہے کیونکہ جس طرح ہر انسان کی طبیعت جدت پسند واقع ہوئی ہے شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے قدیم شعرا کا کلام بے مصرف ہو گیا ہے۔ یا ہمارا ادب اس سے بے نیاز ہو چکا ہے نہیں ہرگز نہیں۔ غالب۔ ذوق۔ انیس۔ دبیر۔ نظیر۔ داغ کا کلام آج بھی وہی مزا دیتا ہے جو نصف صدی قبل دیتا تھا۔ ان سے پہلے کے شعرا میں میر۔ درد۔ سودا۔ سوز۔ انشا۔ مصحفی کے کلام کے مشہور نشتر آج بھی سننے والے کو اسی طرح بے چین کر دیتے ہیں جس طرح آج سے سو برس پہلے وہ دل میں جا کر چبھ جاتے تھے۔ یہ چھوٹا سا تذکرہ انھیں جواہر ریزوں کا حامل ہے جن سے ہمارے نوجوان اور ہماری آئندہ نسلیں ہمیشہ مستفید ہوتی رہنگی۔ خاکسار نظامی بدایونی۔ ۲ اپریل سنہ ۱۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصہ اوّل

(١) وَلی دکنی ١٧٤٢ء

ولی محمد یا ولی اللہ نام تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کا نام شمس الدین لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی ولادت اور وفات کے سال میں اختلاف ہے۔ بقول صاحب تذکرہ شعرائے دکن ولادت ١٠٥٣ھ مطابق ١٦٤٣ء اور وفات ١١٥٥ھ مطابق ١٧٤٢ء میں ہوئی یہی تاریخیں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ ولی کا مولد اورنگ آباد (دکن) تھا اسی وجہ سے وہ دکنی مشہور ہیں۔ وفات احمد آباد (گجرات) میں ہوئی۔ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے اگرچہ اردو زبان میں ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ غزل سرائی کرنے والے شاعر ان سے پہلے بھی گزرے ہیں

وَلی کے وقت سے ہمارے زمانہ کی اُردو میں نمایاں فرق ہوگیا ہے اور ان کے دیوان کو موجودہ اُردو ادب میں قدیم اُردو کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے لیکن آج بھی باوجود صدیاں گزر جانے کے بعض بعض اشعار اُن کے دیوان میں بہت صاف ملتے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے   مرد کا اعتبار کھوتی ہے

وَلی کا دیوان مختلف مطابع میں چھپ چکا ہے لیکن اب کمیاب ہے اس کا ایک اڈیشن پیرس میں نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۸۳۳ء میں شایع ہوا تھا جس کا دیباچہ فرانسیسی زبان میں مسٹر جے ہیل گریسن ٹاسی نے لکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت احسن مارہروی کا مرتبہ "دیوان ولی" مع فرہنگ ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن نے شایع کیا ہے جو نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں سے بھی مل سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱)

دل طلبگارِ نازِ مہوش ہے	لطف اس کا اگرچہ دلکش ہے
مجھ سوں کیونکر ملیگا حیراں ہوں	شوخ ہے بے وفا ہے سرکش ہے
کیا تری زلف کیا تری ابرو	ہر طرف سوں مجھے کشاکش ہے
تجھ بن اے داغِ عشق سینۂ دل	چمنِ لالہ دشتِ آتش ہے

اے وَلی تجربہ سے پاتا ہوں
شعلۂ آہ شوقِ بے غش ہے

(۲)

حُسن تیرا سورج پہ فاضل ہی
مکھ تمار شابِ ماہِ کامل ہی

رات دن تجھ جمال روشن کوں
فضلِ پروردگار شامل ہی

جس کوں تجھ حسن کی نہیں ہی خبر
بےگماں وہ جہاں میں غافل ہی

عِشق کی راہ کے مسافر کوں
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہی

ای وؔلی طرزِ عشق آساں نہیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہی

(۳)

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو! ہشیار ہو ہشیار رہو
کب تک رہےگا خواب میں بیدار ہو بیدار رہو

گر دیکھنا ہی مُدّعا اُس شاہدِ معنی کا تو
ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار رہو

جیوں چترِ داغِ عِشق کوں رکھ سر پہ اپنے اوّلاً
تب فوجِ اہلِ درد کا سردار ہو سردار رہو

وہ نورِ چشمِ عاشقاں ہی جیوں سحر جگ میں عیاں
ای دیدہ وقتِ خواب میں بیدار ہو بیدار رہو

مطلع کا مصرع ای وؔلی وردِ زباں کر رات دن

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار رہو ہشیار رہو

(۴)

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیونکہ حاصل ہو مجھ کو جمعیت — زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب — مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیونکہ ملنا صنم کا ترک کروں — دلبری اختیار کھوتی ہے

ای ولی آب اس پری رو کی
میرے دل کا غبار کھوتی ہے

(۲) سودا ۱۷۸۱

میرزا محمد رفیع نام ۱۱۲۵ھ کو دہلی میں ولادت ہوئی۔ ان کے بزرگ تجارت کرنے کے لیے کابل سے ہندوستان میں آئے تھے اور آپ ہی رعایت سے انھوں نے سودا تخلص اختیار کیا تھا۔ شاہ حاتم کے تلامذہ میں نامور اور اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت استاد تھے حضرت میر کے ہمعصر تھے انھوں نے قصائد کے لحاظ سے اردو کو فارسی کا ہم پلہ بنا دیا تھا تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے خصوصاً ہجوگوئی میں کمال حاصل تھا جب دہلی اجڑ کر لکھنؤ آباد ہوا تو دیگر اہل کمال کے ساتھ شعرا میں سب سے پہلے میرزا صاحب لکھنؤ کو منتقل ہوئے اور وہیں بعمر ۷۰ سال ۱۷۸۱ء مطابق ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا

ان کی کلیات کو سنہ ۱۱۹۵ھ میں حکیم سید اصلح الدین خاں نے مرتب کیا تھا جو ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

(۵) غزل

نسیم ہی ترے کوچے میں اور صبا بھی ہی	ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہی
ترا غرور، مرا عجز تا کجا ظالم	ہر ایک بات کی ظالم کچھ انتہا ...
جلے ہی شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے	کہیں ہو پر بھی جگ ...
زبانِ شکوہ سوا اب نہ ماننے میں ہیہات	کوئی کسی ...

ستم روا ہی اسیر دل ...
چمن چمن گلہ ...

ٹوٹے تری نگہ سے اگر د...
دوزخ مجھے قبول ہی ...
غافل غضب ہے ...
قطرہ گرا تھا جو کہ ...
ای برق کس طرح ...
زاہد بھی ہی ...
سودا اگر ...

(۷)

جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے
آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
باغِ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
ہائے جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
ہرچند پہ نہ اتنا
آئینہ حبابی

پھر گل سے ای پیارے بلبل کبھو نہ بولے
شبنم سے کہدے بلبل پیارے گلوں کے دھولے
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سیکڑوں پھپھولے
اس دل پہ کل جو ہوگی سو آج ہی نہ ہولے
منہ جا ہیں چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کہیے یہ سودا گلی میں اس کی
کھول کر تو لے

بہار میں شاخِ بریدہ ہوں
بیج عبث آفریدہ ہوں
گریباں دریدہ ہوں
خوں چکیدہ ہوں
دلبر ندیدہ ہوں
من کشیدہ ہوں
یدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

(۹)

خانہ پرور چمن ہیں آخر اے صیاد ہم
خندۂ گل بے نمک ہے یا دِ بلبل بے اثر
خاکساروں سے موافق کب ہے دنیا کی ہوا
ذبح تو کرتا ہے ٹک فرصت گلے لگنے کی دے
جب سنی مجنوں گیا اپنے قدم کے فیض سے
نکل سکتے نہیں سے تری اے سرو قد

اتنی رخصت دے کہ ہو لیں گل سنی آزاد ہم
آہ اس گلشن سے جا کر کیا کریں گے یاد ہم
راہ میں تیری گئے جیوں نقشِ پا برباد ہم
عید قرباں کی تجھے دے لیں مبارکباد ہم
خانۂ زنجیر رکھتے ہیں سدا آباد ہم
طوق قمری کی طرح رکھتے ہیں مادر زاد ہم

ہے جنوں مصرعہ ترا سودا اسکا ہی بہ زنجیر پا
قید سے تیری نہیں ہونے کے اب آزاد ہم

(۳) خواجہ میر درد ۱۷۸۵ء

خواجہ محمد میر دہلوی غزل میں تصوف اور معرفت کے پاکیزہ مضامین نظم فرماتے تھے اکثر چھوٹی چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کرتے تھے کلام میں سنجیدگی اور متانت کا لحاظ رکھتے تھے فارسی کے عارفانہ خیالات کو اردو زبان کا لباس پہنانے میں انھوں نے جو صفائی اور سادگی برتی ہے وہ ان کے دیوان اردو سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے

دہلی کے اجڑ جانے پر اکثر شریف خاندانوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہنی شروع کر دی تھی مگر توکل اور قناعت نے انھیں دہلی سے باہر نہ جانے دیا اور اپنے سجادے پر بیٹھے رہے خواجہ صاحب نے ۲۴ جنوری ۱۷۸۵ء مطابق ۱۱۹۹ھ کو انتقال فرمایا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۰) غزل

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اسے آہ نے اثر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

کیوں بھوئیں تانتے ہو بندہ نواز
سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۱۱)

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو گئے اے درد مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

(١٢)

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھو تو اپنے بھی دل کا دماغ تھا

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں کہ لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

(١٣)

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضیٔ الٰہی ہو

نگینے کے سوا کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے
کہ ہو نام اور کا روشن و اپنی روسیاہی ہو

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

(١٤)

سرسبز تھا نیستاں میرے ہی اشکِ غم سے
تھے سیکڑوں ہی نالے البتہ ایک دم سے

واقف نہ یاں کسی سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے
یعنی کہ آگئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے

دیں گو نہیں ازل سے پر تا ابد ہوں باقی
میرا حدوث آخر جا ہی بھڑا قدم سے

گر چاہیے تو ملیے اور چاہیے نہ ملیے
سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں ہے ہم سے

مشتاق گر ترا کچھ لکھے تو کیا عجب ہے
ہوں مثلِ نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے

ہر چند یہ تمنا در خور نہیں ہمارے
نزدیک تو جو آئے کیا دور ہے کرم سے

اب ہیں کہاں وہ نالے سرگشتگی کدھر ہے
تھیں سب وہ باتیں تا بہ مرے ہی دم قدم سے

ہے اک نگاہ کافی کو ہووے گاہ گاہے
چنداں نہیں ہے مطلب عاشق کو بیش و کم سے

کاہے کو ہوتی ہم کو گردش نصیب طالع
گر پاؤں اپنا باہر رکھتے نہ ہم عدم سے

آتے ہیں دام میں کب خورشید رد کسو کے
اے شیخ یہ نہیں ہیں تسبیح کے تھمے سے

ہے دردؔ پر بھی کچھ تو میری ہی سی مصیبت
گھیرے ہے اور ہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(۱۵) رباعیات

ہم نے بھی کبھی جام و سبو دیکھا تھا
جو کچھ کہ نہیں ہے درد برہ دیکھا تھا
ان باتوں کو اب جو غور کرتے ہیں دردؔ
کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

(۱۶)

کس کا کون! کیا کسو سے کہنا
اپنا اپنا ہر ایک کا لہنا
گزرے ہے اب اس طرح سے اپنی اے دردؔ
رونا چپکے بیٹھے اکیلے رہنا

(۴) حسن ۱۷۸۹ع

میر غلام حسن خلف غلام حسین ضاحک۔ بزرگوں کا اصلی وطن ہرات ہے گو دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم وضع کے بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدا میں میرزا رفیع سودا سے

اصلاح لی اس کے بعد خواجہ میر درد سے استفادہ سخن حاصل کیا اور سب سے آخر میں ضیاء الدین ضیا دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد آپ نے فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں نواب سردار جنگ کے مصاحبوں میں داخل ہو گئے تھے یوں تو میر حسن جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ مگر مثنوی بدر منیر آپ کے کمال شاعری کا بے نظیر نمونہ ہے جس میں جذبات انسانی کی تصویر کچھ ایسے طریقے سے کھینچی گئی ہے کہ زمانہ حاضرہ میں بھی وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کہنے کو تو بدر منیر میں ایک فرضی قصہ نظم کیا ہے لیکن اس میں قدرت کے مناظر انسانی کی بولتی چالتی تصاویر غم و رنج کے جذبات شادی اور حسرت کے کوائف کو جس خوبی سے دکھایا ہے اس کی متقدمین اور متاخرین کے کلام میں مثال نہیں ملتی آصف الدولہ نے اس مثنوی کے صلے میں ایک قیمتی دوشالہ عطا فرمایا میر حسن نے ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں وفات پائی مثنوی کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۷) غم ہجر

بدن کو جو دیکھا تو زار و نزار
زباں پر ہیں باتیں ورے دل اُو اس
نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں
جو مستی ہے دو دن کی تو ہے وہی

کسی کو کوئی دیوے جیسے فشار
پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو کنگھی نہیں کی تو یونہی سہی

جو سینہ کھلا ہے تو دل چاک ہے
غم آلودہ صبحِ طربناک ہے

نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام
نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا سبھاؤ
کہ بگڑے سے ہے دونا ہو ان کا بناؤ

جو ماتھے پہ چینِ جبیں غم سے ہے
تو وہ بھی ہے اک موجِ دریائے مہ

وہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ
تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ

گریباں جو سینہ پہ ہے کھلا
تو گویا ہے وہ صبحِ عشرت فزا

نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے
و یا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے

ادا سے نہیں یہ بھی عالم جدا
کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

(۱۸) خوابگاہ

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ
جوانی کی نیند اور وہ سونے کا رنگ

ہر اک سراپچے زری باف کے
کہ تھے رشکِ آئینہ صاف کے

کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف
کہ ہو چاندنی جس صفا کا غلاف

کسے اس پہ کسنے وہ مقیش کے
کہ جھبوں میں تھے جن کے موتی ٹکے

دھرے اس پہ تکیے کئی نرم نرم
کہ مخمل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم

(۱۹) شوخی رفتار

عجب چال سے وہ چلے نازنیں
کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں

بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال
کمر کی لچک وہ مٹک کی وہ چال

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی عجب ایک عالم تھا بے ساختہ	اکڑ بے سے کڑ سے کو بجاتی ہوئی کہ عالم کا تھا اُس سے دل باختہ

(۵) قایم ۱۷۹۴ء

شیخ محمد قایم نام تھا قصبہ چاندپور ضلع بجنور روہیل کھنڈ کے رہنے والے تھے ابتدا میں خواجہ میر درد سے مشورہ سخن رکھتے تھے پھر مرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے۔ ان کا شمار ریختہ کے استادوں میں ہے۔ سلاست اور صفائی ان کا حصہ تھی ان کے بعض اشعار ضرب المثل کے درجہ تک پہونچ گئے ہیں مثلاً ؎

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی نہیں رہا جاتا

اپنے وطن میں ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا ایک مکمل دیوان چھوڑا کوئی صنف کلام ایسی نہیں ہے جو اس دیوان میں نہ ہو لیکن دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل اور مثنوی سے اس شاعر کی طبیعت کو بہت لگاؤ رہا ہے ان کا دیوان ہنوز طبع نہیں ہوا۔ عرصہ ہوا ایک انتخاب مولانا حسرت موہانی نے شایع کیا تھا اور دوسرا انتخاب ممتاز اشعار کے نام سے نواب عماد الملک بہادر بلگرامی نے ترتیب دیا ہے جو مدراس یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

(۲۰) غزل

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں	ہو یوں تو زلفِ یار بھی ہم سا...

ؔ میر کے ہاں یہ شعر اس طرح درج ہے: کیا نہیں کچھ کہا نہیں جاتا ؎ ...

ساقی تو شب کی دست درازی معاف کر
ظالم قسم لے مجھ سے مجھے کچھ خبر نہیں

یارب خلش سے آہ کی ہو جو نہ بہرہ مند
جس دل کا تکیہ گاہ سر نیشتر نہیں

جوں اشک ایک لغزش پا میں گئے ہیں یاں
ہستی سے تا بہ نیستی چنداں سفر نہیں

بندہ ہوں بیخودی کا میں اُس مست کی جسے
آشوب روز حشر سے اصلا خبر نہیں

(۲۱)

ایک جا کہ یہ نہیں ہی مجھے آرام کہیں
ہی عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

اُس کمرے نگہ شوق لپٹتی تو ہی لیک
جی یہ دھڑکے ہی کہ آجائے نہ الزام کہیں

تم نے کی دل کی طلب ہم نے کہا دینگے ولیک
یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں

پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اُٹھا
جن نے دیکھا تجھے اک بار سر بام کہیں

عذر تقصیر بھی جا ہونگا میں اس سے اے دل
ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں

عزم کعبہ کا تو قایم تو کیا ہی لیکن
رہن مے کیجو نہ واں جامۂ احرام کہیں

(۲۲)

گہ پیر شیخ و گاہ مرید مغاں رہے
اب تک تو آبرو سے نبھی ہی جہاں رہے

صبر و قرار و ہوش و دل و دیں تو واں رہے
اے ہم نشیں یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے

دُنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

[illegible] روتے ہو کیا تم ہیں تو یاں
یہ جھینکنا پڑا ہی کسی طرح جاں رہے

قسمت تو دیکھ یار بھی اپنا گرا تو واں — جس دشتِ پُر خطر میں کئی کارواں رہے
پیارے ہمیشہ ایک سی رنجش ہے کچھ بھی لطف — ناخوش کبھی ہوئے تو کبھی مہرباں رہے

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائم وہ مے فروش کی اپنی دکاں رہے

(۱۶) سوزؔ ۱۷۹۷ء

سید محمد نام تھا قادل پور ضلع شاہجہاں آباد کے ساکن۔ ان کے کلام میں ان کے تخلص کا پورا اثر نمایاں ہے یعنی ان کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۰۹ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۲۳) غزل

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں کھا جائے گا — ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا
قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے — ہاں مگر تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے آسوز کو یوں مت ستا
مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائے گا

(۲۴)

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا
یہاں تک کفر پورا چاہیے گر چاک گلشن ہو — بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیل خنجر مژگاں ہوں کیا یہ بھی تعجب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سونے کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

(۲۵)

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا
تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا

نہ پہونچے آہ و نالہ گوش تک اس کے کبھو اپنا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا

خدایا کس سے ہم بندے کہا دیں سخت مشکل ہے
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا

خدا کی بندگی کا سگ ہے دعویٰ تو خلقت کے
نہ لے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خودنمائی کا

(۷) میر ۱۸۱۰ع

میر محمد تقی اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم و تربیت پائی عالی دماغی نازک مزاجی میں یگانۂ روزگار تھے اردو شاعری کے خدائے سخن اور مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں کلام گوناگوں جذبات سے لبریز ہے غزل گوئی میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاق، فلسفہ، حکمت کے مضامین پائے جاتے ہیں اردو غزل میں آپ کا وہ رتبہ ہے جو حضرت سعدی کا فارسی غزل میں۔ ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ جو درد بھی ہے وہ دوسرے شاعر کے کلام میں شاذ پایا جاتا ہے۔ آخر عمر میں خاک اودھ کی کشش نے لکھنؤ پہونچا دیا تھا وہیں سو (۱۰۰) برس کی عمر پاکر ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔ چھ دیوان ...

موجودہ میں حال میں انجمن ترقی اُردو نے کلام میر کا عمدہ انتخاب شایع کیا ہی جس کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن کا دلچسپ مقدمہ شامل ہی۔ آپ کا تذکرہ نکات الشعرا بھی جس میں اپنے معاصرین کے حالات درج کیے ہیں طبع ہو چکا ہی بعض کے نزدیک میر صاحب کی پیدایش ۱۱۳۰ھ میں اور انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہی:۔

غزل (۲۶)

جس سر کو غرور آج ہی یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہی پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رخ سے ہی رخسار پری کا
چلنا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہی اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہی پریشان نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہی پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہی ترا اشک عقیق جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہی چراغ سحری کا

(۲۷)

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرناکی طریق عشق میں پنہاں نہیں
کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر یک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

(۲۸)

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ وہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چین جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانند حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں
یہ گرد باد کوئی بیاباں نورد تھا

گزری مدام اس کی جوانان مست میں
پیر مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

(۲۹)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے | جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

(۳۰) قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا | یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر | میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہم ہی میں میر | سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

(۳۱) غزل

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اِس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اُس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں

بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کے اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا کلیسا کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب منہ سے برقع اُٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اُس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

ساعد سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی اُن نے جوں جوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

تلک
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

(۳۲)

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے
آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دُنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اُس کے اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماریِ دل کی رسم شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے
کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اُڑتے ہوا میں سارے اپنا اُتارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں سے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اس کے
یار کے آ جانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دمدار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

(۸) جرأت ۱۸۱۰ء

شیخ قلندر بخش دہلوی بذلہ سنج لطیفہ گو معاملہ بند شاعر تھے۔ سلیمان شکوہ نواب اودھ کی ملازمت میں داخل تھے عالم شباب میں بینائی جاتی رہی تھی طبیعت کو رنگ تغزل سے ایک خاص مناسبت تھی حسن و عشق کے واقعات اور عاشق و معشوق کے راز و نیاز ان کی شاعری کا جزو اعظم ہیں علمی استعداد کم تھی۔ بلکہ صاحب تذکرۂ آب حیات نے یہاں تک لکھدیا ہے کہ عربی زبان سے نابلد تھے ۱۸۱۰ء مطابق

۱۲۲۲ھ لکھنؤ میں وفات پائی بعض غزلیات میں ایک ہی مضمون لکھا ہے۔ ایک موقعہ پر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

غزل (۳۲)

اے دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتا
جا کے ہم روتے ہیں پہروں پسِ دیوار کہ تو

ہاتھ کیوں عشقِ بتاں سے نہ اٹھایا تو نے
کفِ افسوس ہم اب ملتے ہیں ہر بار کہ تو

وہی محفل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکلِ گنہگار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ لب سے نہ لگا ساغرِ عشق
مے اندوہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

بے جگہ جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا نا دل
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچوں ہیں آہِ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

غور کیجے تو یہ مشکل ہے زمیں اے جرأت
دیکھیں ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

(۳۳)

میرے رونے سے تو کچھ گرمیِ بازار نہیں
میں ہوں وہ جنس کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

دل تو امڈے ہے یہ حیرت ہے میں کیونکر رو دوں
آپ تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں

درد کیا جانیئے کیا کیا یہ بیاں کرتا ہی تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی	دہنِ زخم کو گویا لب گفتار نہیں جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

(۳۴)

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو دیکھنا زلف و رُخ تمھیں ہر وقت	کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

(۹) انشاء ۱۸۱۷ء

سید انشاء اللہ خاں دہلوی. نواب سعادت علی خاں بادشاہ اودھ کی مصاحبت میں داخل تھے ان کی جامعیت اور علمی قابلیت کم نہ تھی مگر لکھنؤ کا رنگ دیکھ کر ظرافت پر اُتر آئے تھے پھر بھی ان کے کلام میں جدت اور انداز بیان کا خاص لطف پایا جاتا ہی اُردو زبان میں سب سے پہلے صرف و نحو کے قواعد منضبط کیئے. دریائے لطافت جس کی زبان فارسی ہی ان کی مصنفہ ہی اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہی جس میں عروض معانی و بیان سب کچھ موجود ہی یہ کتاب حال میں انجمن ترقی اُردو کے زیر نگرانی اُردو میں شایع ہوئی ہی حضرت انشاء کی کلیات علم ادب کا عجائب خانہ ہی جس میں دیوان ریختہ. دیوان ریختی. پہیلیاں طلسمات کے نسخے. پشتو کے قواعد مثنویات. گرمی کی شکایت بھڑوں کھٹملوں پسوؤں کے بیانات حکایتیں معمے چیستاں شامل ہیں جو ان کی خداداد ذہانت اور علمی قابلیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں کوئی ایسا رنگ نہیں جو کلام میں موجود

نہ ہو ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

(۳۵) غزل

مجھے رونا آتا ہے شمعِ سحر پر
کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر

اجی! کیوں رلاتے ہو مجکو تمھیں کیا
نہیں رحم آتا مری چشمِ تر پر

یہی وضع ہے تو مجھے کھوئیے گا
پڑے پھرئیے گا ہاتھ رکھے کمر پر

اجی جی میں ہے اب کہیں بیٹھ رہیئے
بس اک باندھ تکیہ کسی رہ گذر پر

جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو
مطوّل کو دے مار تو مختصر پر

کچھ اک صاف صاف ایسے لکھ شعر انشا
کہ وہ ماریں چشمک صفائے گہر پر

(۳۶)

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خیال ان کا پرے ہے عرشِ اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں.

نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہی افتادگی سے ان دنوں پہردن
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کس کو! آہ! ننگ و نام کیا شے ہی
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہی اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہی تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہی بھلا انشا
غنیمت ہی کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۳۷)

مجھے کیوں نہ آشے ساقی نظر آفتاب اُلٹا
کہ پڑا ہی آج خم میں قدحِ شراب اُلٹا
عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا
...گشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا
...ے بارش کوئی مست پڑھکے نعرے
جو زمیں پہ پھینک مارے قدحِ شراب اُلٹا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں	وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
ہوئے دعدے پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور	ارے لو دیکھو کچھ تماشا یہ سنو عتاب الٹا
کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئے کو	وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ ہوا خراب الٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیونکر انشا
کہ ہوا نے خود بخود آ ورق کتاب الٹا

(۱۰) مصحفی سنہ ۱۸۲۴ع

شیخ غلام ہمدانی امروہہ ضلع مرادآباد کے شیخ زادگان سے تھے عنفوان شباب میں طالب علمی کرنے دہلی آئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کرلی آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے میرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کے زمانہ میں سید انشا سے مقابلے ہوئے کسی کے شاگرد نہ تھے مگر زبان میں سودا اور میر کی پیروی کرتے تھے فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے اردو میں چھ دیوان تصنیف کیئے تھے مشکل زمینوں میں عمدہ شعر نکالتے تھے سنہ ۱۸۲۴ع میں وفات پائی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

(۳۸) غزل

لاف خوبی ترے عارض پہ گلشن ہارے	آتش رخ پہ صبا طیش سے دامن مارے
کیا غضب ہے جو تو غرفے میں کھولے بال پرے	اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے
ہے یہ خوش حال انھوں کا جو ترے کوچے میں	خاک منڈے کو ملے بیٹھے ہیں آسن مارے

دشمن و دوست کو الفت نے تری ایک کیا
ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

ہم ترے واسطے ای غیرت لیلی کب تک
قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے

وہ جو آنکھیں ہیں تری رہزن خونیں کافر
قافلے لوٹ لیے سیکڑوں رہزن مارے

ضبط سے مصحفی اک کام مرا درگزرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

(۳۸)

گرے جو اس کی نظر سے تو پھر کہاں کے ہوے
نہ ہم زمیں کے ہوئے ورنہ آسماں کے ہوئے

قفس سے جھانک ہی لیویں گے گل کو ایک برس
جو رخنے بند نہ دیوار گلستاں کے ہوئے

ہی جائے شکر کہ ناشستنی یہ ہم سے لوگ
تری گلی میں سزاوار امتحاں کے ہوئے

عجب نہیں ہے کہ بلبل کو ہووے نشو و نما
کہ اس ہوا میں ہرے خار آشیاں کے ہوئے

نظر سے نافۂ لیلیٰ یہ ہوگیا غائب
کہ لوگ ہر طرف آوارہ کارواں کے ہوئے

متاع حسن کے تو دے لگے جہاں دیکھے
ہم ایک بار خریدار اس دکاں کے ہوئے

ہزار شکر کہ ان گلرخوں کی مجلس میں
گئے جو ہم تو نہ شرمندہ برگ پاں کے ہوئے

گلی میں اس کی جو ہم مر گئے تو بعد مرگ
سگ و ہما ہیں کئی حصے استخواں کے ہوئے

بلیغ دہر ہی اے مصحفی تو لاشک و ریب
جو تھے فصیح وہ بندے تری زباں کے ہوئے

(۱۱) نظیر سنہ ۱۸۳۰ء

ولی محمد اکبر آبادی بزرگوں کا اصلی وطن شاہجہان آباد تھا دہلی کی تباہی او- بربادی کے بعد اکبر آباد آئے اور روضہ تاج گنج کے قریب سکونت اختیار کی معلمی کا پیشہ کرتے تھے شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے ان کے کلام میں قدرت کے مناظر کی جھلک پائی جاتی ہی۔ ہندوستان کے میلوں ٹھیلوں، آزاد فقیروں کے مجمعوں پُر تکلف مجالس، اور بے تکلف ٹولیوں میں ان کی نظموں کو مزے لے لیکر پڑھا جاتا ہی روزمرہ کے محاورات ہر موقع و محل کی اصطلاحات صاف اور سیدھی زبان میں لکھتے تھے۔ یہ روایت بھی مشہور ہی کہ شاہ اودھ نے ان کو معقول تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور لکھنؤ بلایا تھا مگر وہ آگرہ کے حدود سے باہر نہ نکلے۔ ۱۶ اگست سنہ ۱۸۳۰ء مطابق ۲۶ صفر سنہ ۱۲۴۶ھ کو آگرہ میں انتقال کیا تاج گنج میں دفن ہوئے کلیات نظیر قدیم کے علاوہ اس کا ایک جدید اڈیشن اعلیٰ پیمانہ پر نول کشور پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہی اور پروفیسر شہباز نے ان کی مبسوط سوانح عمری جس میں کلام پر تنقید بھی کی گئی ہی۔ زندگانی بے نظیر کے نام سے لکھی ہی جو مطبع مذکور میں چھپی ہی۔ آخر میں ان کے منتخب کلام کا مجموعہ مخمور صاحب اکبر آبادی نے مع فرہنگ و حواشی آگرہ اخبار پریس میں چھپوایا ہی جس میں مخمور صاحب کا مقدمہ اور تبصرہ بھی شامل ہی۔

کلام کا انتخاب یہ ہی۔

(۴۰) برسات کا تماشا

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے | جگنوں چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے
لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے | گرتی ہے چھت کسی کی کوئی کھڑا پکارے
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہاتھوں میں ہیں ہر اک کے پھولوں کی لال چھڑیاں | بجلی چمکتی پھرتی اور لگ رہی ہیں جھڑیاں
گل بوٹوں کے جو اوپر بوندیں ہیں مینہ کی جڑیاں | برسیں ہیں بادہ خواروں اب بیتوں کی لڑیاں
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(۴۱) تاج گنج

یارو جو تاج گنج یہاں آشکار ہے | مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے | روضہ جو اس مکان میں یکتا نگار ہے
ایسا چمکتا ہے کہ تجلی سے ہے عیاں | جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے
ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند | ہر بار جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے
تعریف اس مکاں کی میں کیا کیا کروں نظیر
اس کی صفت تو مشتہر روزگار ہے

(۴۲) بنجارہ نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا | قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا | کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقے سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی
کیا برتن سونے چاندی کے کیا ہنڈیا چینی مٹی کی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل

گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ	کیا چلون پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر	جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر	کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے	جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے	کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لعل عماری کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے	سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے	کیا بغچے تاج مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا	تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا	گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن	ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بند چیلا نیک چلن	کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک تنکا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۴۳) ہنس نامہ

دنیا کی جو الفت کا ہوا اس کو سہارا
اور اس نے خوشی کو مری خاطر میں اتارا
دیکھی جو یہ غفلت تو مرا دل یہ پکارا
آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اس کا گزارا

چنڈول، اگن، ابلقے، چھپان، بئے، ڈھیر
مینا و بئے، کلکلے، بگلے بھی سمنبر
طوطے بھی کئی طور کے ٹوئیاں کئی لہبر
رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر
اس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

بلبل نے کیا اس کی محبت میں خوش آہنگ
اور کوکلے کوئل نے بھی الفت کا لیا سنگ
کھنجن میں کلنگوں میں بھی چاہت کی مچی جنگ
دیکھا جو طیوروں نے اسے حسن میں خوش رنگ
وہ ہنس ہوا سب کی نگاہوں میں پیارا

سیمرغ بھی سو دل سے ہوئے ملنے کے شائق
گرڈ پنکھ بھی پنکھوں کے ہوئے جھلنے کے لائق
سارس بھی جو اصل تھے ہوئے اس کے موافق
باز و لگڑ و جرہ و شاہین ہوئے عاشق
ٹنکروں نے بھی ٹنگر سے کیا اس کا مدارا

کچھ سبزک و بڑنکے و کچھ ہنٹن و بٹیرے
پنڈخی سے گکا بوبڑ و قمری ہریوے

غوغائی بکھیری و لٹورے و بیلھیے
کچھ لال چڑے پودنے پدی ہی نہ غش تھے
پدڑی بھی سمجھتی تھی اسے آنکھ کا تارا

چاہت سے گرفتار بٹیریں تو رہے تیتر
لگکو کی تا ڑوں کے بھی چاہت میں بندھے پر
ہدہد بھی ہوئے مست بگلے بڈھیا ادھر اودھر
زاغ و زغن و طوطی و طاؤس و کبوتر
سب کہنے لگے اس کی محبت کا اشارا

شکل اس کی وہ ہیں جی بھی شام چڑے کے
دی چاہ جتا پھرتے جہانوں نے بھی جھدپے
ہریل بھی ہوئے اس کے بڑے چاہنے والے
بجلنے غرض اس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے
اس ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دم اسے دیکھیں
اور اس کی محبت سے ذرا منہ کو نہ پھیریں
دن رات اسے خوش رکھیں نت اسے سکھ دیویں
صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں
اک چندر ہا خوب محبت کا گزارا

سب ہو گئے خوش اس کی مے الفت لگے پینے
اور رہنے لگے ہر ایک وہاں بھر لیے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے
اس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے
اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یاں لطف و کرم تم نے کیے ہم پہ ہیں جو جو
تم سب کی یہ خوبی ہی کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہووے تو بخشو
لو یارو ہم اب جاوینگے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اب تک تو بہت ہم رہے وصلت سے ہم آغوش
جب فرقت جانی کا پرندوں نے کیا گوش
اب یار و وطن دل کی ہمارے ہوئی ہم دوش
ان بات کے سنتے ہی جو ہر ایک کے اڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

بن دیکھے تمہارے ہمیں کب چین پڑینگے
گر تم نے یہ ٹھہرائی تو کیا سکھ سے رہینگے
اک آن نہ دیکھینگے تو دل غم سے بھرینگے
ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاویگا سہارا

پھر ہنس نے یہ بات کہی ان سے کئی بار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گہربار
کچھ بس نہیں اب چلنے کی ساعت سے ہیں ناچار
اتنے میں جو شب گزری ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہوا پر نہ ہوئیں اس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ
دیکھا جو اسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ
منہ پھیر کے ادھر سے وطن کی ہمیں لی راہ
سب ساتھ چلے اس کے وہ ہمراہ ہوا خواہ
ہر ایک نے اڑنے کے لیے پنکھ پسارا

اور ہنس کی ان سب کو رفاقت ہوئی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب ہو رہی غالب
جب اس سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
دو کوس اڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر ہیں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

پر ان کے ہوئے پر جنھیں دوری کی تھی ہوس
تھک تھک کے لگے گرنے تو کرنے لگے افسوس
رو رو کے رفاقت کی کریں کیونکہ قدم بوس
کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ اڑا کوس

کوئی آٹھ کوئی نو کوئی دس کوس میں ہارا

کچھ بن نہ سکے اُن سے رفاقت کے جو واں کار
جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کے تئیں ہار
اور اتنے لُٹے ساتھ کہ کچھ ہو سکے نہ اُٹھا
کوئی یاں رہا کوئی واں رہا کوئی ہو گیا ناچار
کوئی اور اُدھر آ گئے جو تھا سب میں کرارا

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مے
جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے
سمجھے تھے بہت دل میں جو الفت کو بڑی شے
چیلیں ہی کوّے گرے اور باز بھی تھک کے
اُس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

دنیا کی جو الفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ
ناچار ہو جس جا ہیں تو واں کیجے کیا چاہ
جب مشکل یہ ہوئے تو بھلا کیونکہ ہو نباہ
رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

(۱۳) شہیدی ۱۲۳۷ء

منشی کرامت علی خاں ولد عبدالرسول خاں عروضی موضع دائرہ پورہ ضلع اوناؤ کے باشندے تھے۔ شاعری میں مصحفی اور نصیر دہلوی کے شاگرد تھے فقیرانہ لباس میں عرصۂ دراز تک بریلی میں رہے تھے۔ اُن کا نعتیہ و عاشقانہ کلام مستانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے دیوان طبع ہو چکا ہے ۱۲۵۲ھ ۱۸۳۶ء میں جس وقت مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور روضۂ مبارک کو دیکھا تو فرط اشتیاق میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور یہ شعر بقول

ہوگیا ہے

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

غزل (۴۶)

سنگ گر سینے میں ان کے عوض دل ہوتا — کار عشاق نہ اس مرتبہ مشکل ہوتا
گھر سے جب سیر کو صحرا کے نکلتی لیلیٰ — نجد کے رخ پہ اٹھا پردۂ محمل ہوتا
بیٹھ جاتا لب فرش آکے اگر ایک گدا — اس میں نقصان ترا کیا صاحب محفل ہوتا
دل میں ارمان ہے یہ سیر چمن کا اس تنگ — کہ مرے ساتھ نہ زیبندہ شمائل ہوتا
اس کی بدھی کے لیے پھول میں چنتا پھرتا — ہاتھ اس کا مری گردن میں حمائل ہوتا

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

(۴۷)

غضب ہے جس بت کافر پہ اپنا دم نکلتا ہے — بنا تابوت اس کے کوچے سے ہر دم نکلتا ہے
نہ رکھ آنکھوں پہ میری آستین لطف اے ہمدم — کہ اشک سرخ کے ہمراہ دل کا غم نکلتا ہے
دکھا کر اپنی آرائش پری مجھ کو نہ دھوکا دے — کسی کے سادہ پن میں بس یہی عالم نکلتا ہے
وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو — سمجھ رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے
سمجھ کر اجنبی میں جس سے دل کا راز کہتا ہوں — خجل ہوتا ہوں کیا کیا جب ترا محرم نکلتا ہے
بنا دیتا ہے کوچہ فقر کا ٹیڑھے کو بھی سیدھا — کھنچا جب جنتری میں تار کا سب خم نکلتا ہے

شہیدی سے نہیں واقف مگر اتنا تو واقف ہے
کہ راتوں کو کوئی کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(۱۲) ناسخ ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش نام۔ اصلی وطن لاہور تھا۔ فیض آباد میں تعلیم پائی تھی فارسی کے ماہر تھے اُردو زبان کی تراش خراش اور بندشوں کی چستی اور تعقیدات کا دور کرنا یہ سب ان کی ایجاد ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کو نیا جامہ پہنا دیا تھا اُن کا اعلیٰ ترین پایہ تحقیق اور اُن کی استادی مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح مبالغہ اور تشبیہات سے زیادہ کام لیا ہے لیکن اس کو اس طرح نبھایا ہے کہ اس سے کلام کا زور گھٹنے نہیں پایا یہ اُن کی اُستادی پر دال ہے چونسٹھ پینسٹھ برس کی عمر پاکر ۱۲۵۴ھ ۱۸۳۸ء میں دنیا کو خیرباد کہی۔ کلیاتِ ناسخ مطبوع خاص و عام ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۴۳) غزل

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہوں شعر تر پیدا
ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا

وہ نخلِ باغِ جہاں ہیں ہم کہ ہوتی ہے
ہر ایک شاخ پہ لیے دستۂ تبر پیدا

کیا ہے آتشِ غم نے مرا یہ خشک لہو
کہ مثلِ سنگ رگوں میں ہوئے شرر پیدا

شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو بو نہیں آتی
ہو چاک چاک اگر دل تو ہو اثر پیدا

جو ہیں حسین وہ مفلس کبھی نہیں رہتے
گداز کے ساتھ ہی ہوتا ہے دیکھو زر پیدا

میں بے خبر ہوں مگر ہے جنونِ عشق نہاں — ہوئے ہیں داغ چھپانے کو موئے سر پیدا
یہ رنگت اس کی سنہری ہو گر نہائے کبھی — نیا رہے کہ کریں حمام سے بھی زر پیدا
نہ داغ یاس سے گھبرا آئے گی امید — گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا
بلائے چشم نہ حسن اور نہ نغمہ آفتِ گوش — کریں وہ چین ہوئے ہیں جو کور و کر پیدا

غزل (۴۴)

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے — کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا
شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم وائے بیدردی — فلک تک گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا
سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے — کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا
وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے — کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا
کفن کی جیب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں — تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا
مرا ویرانہ مثلِ آئنہ معمورِ حیرت ہے — یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا
کسی نے لاش وحشت سے مرا میں نزع اٹھایا — نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

(۴۵)

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا — کہ ہو خجل چاند چودھویں کا

جو حلقہ ہی زلف عنبریں کا۔ وہ ایک نافہ ہی مشک چیں کا
یہ اُس کی ہی سیاہ عدول کا عالم۔ کہ جس نے دیکھیں ہوا وہ بیدم
نیام تیغ قضائے مبرم۔ لقب ہی قاتل کی آستیں کا
یہ جوش پر یاں ہی اشک کا یم۔ کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم
جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم۔ شرارہ ہی اک آہ آتشیں کا
بُرا ہو یا بخت عاشقی کا۔ نہ دیں ہو برباد۔ یوں کسی کا
بنا ہی عشق بتاں میں ٹیکا۔ نشان سجدہ مری جبیں کا

طمع ہی انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب بجائے
کیا ہی ناسخ نے آسماں سے۔ بلند تر رتبہ اس زمیں کا

(۱۴۳) میر ممنون ۱۲۶۱ھ

میر نظام الدین۔ سید قمرالدین خاں منت دہلوی کے بیٹے اور شاگرد تھے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ خود ان کے قلم کا لکھا ہوا دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہی اکبر شاہ ثانی کا زمانہ دیکھا تھا عہد انگریزی میں اجمیر کے صدر الصدور تھے ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں انتقال ہوا کلام کا انتخاب یہ ہی:-

(۴۶) غزل

ہم سبز تخم دوستی ہوئے بغیر دل کہاں
بارے بزیر آسمان ایسی زمین قابل کہاں

مدت سے ہم چل بھی بسے پر بزم خالی دیکھ کے
اس نے نہ پوچھا ایک دن ہم آج وہ بیدل کہاں

بیچین سا ہوں خود بخود کچھ اور تو واقف نہیں
مفتوں جی کس پہ ہوا دل ہو گیا مائل کہاں

بحرِ حوادث کا یہ شور بادِ مخالف کا یہ زور
کشتی بھی ہے موجوں میں ٹوٹی ہاتھ آئے اب ساحل کہاں

بختِ سیہ کا مرتبہ ٹک دیکھیو اک نقطہ وار
اس کے دہن نے وہم کے رخ پر بنایا تل کہاں

تاریک شب یہ پُرخطر کوئی نہ یار و راہبر
دیکھیں کہ ہم بے پا و سر کرتے ہیں اب منزل کہاں

مدت سے ہم ہیں اے قفس اے ہم صفیر کیا خبر
غنچے کدھر کو ہیں گئے گل وہ گئے ہیں کھل کہاں

سو بار ہوں میں کہہ چکا خوباں سے مت مل ہے برا
لیکن سمجھتا ہے بھلا اپنا دل جاہل کہاں

شیشہ بھی ہے ساقی بھی ہے ہے شمع بھی پر بن ترے
وہ خوبیِ مجلس کہاں وہ رونقِ محفل کہاں

کچھ عقدۂ مشکل کا تو ممنون اندیشہ نہ کر
مشکل کشا جب ہے یہ ہمت ہے پھر مشکل کہاں

(۱۵) آتش ۱۸۴۷ء

آتش. خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش دہلوی ۱۷۶۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ خواجہ صاحب رند مشرب آزاد مزاج، شوخ طبع شاعر تھے۔ فن سخن میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے تلمذ حاصل تھا۔ شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے۔ سلاستِ زبان اور صفائی کلام نے لکھنؤ میں اُن کی جادو بیانی کے ڈنکے بجا دیئے۔ غزل میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاقی مضامین بھی لکھتے تھے۔ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا

کلیات آتش جس میں دو دیوان ہیں ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے نمونہ کلام یہ ہے۔

(۴۹)

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی کہ بھلادے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

آوارگی نکہت گل ہے یہ اشارہ
جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقئ ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

(۵۰)

خاطر ملول جو ہوئے تو گلستاں مانگوں
بجلی گرنے کو جو جی چاہے تو باراں مانگوں

خاک بھی جو ملوں میں تو کسی صحرا میں
تم سے مٹی بھی نہ اے گبر و مسلماں مانگوں

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

رنج سے عشق کے ہے راحت دنیا بدتر
زخم خنداں ہو اگر میں گل خنداں مانگوں

یاس و حرماں میں جو لہو کے چنے بھی تو چباؤں
نعمت عشق کے قابل لب و دنداں مانگوں

ملتی ہو مانگنے سے باغ جہاں میں جو مراد
گل سے بلبل کے کفن کیلئے داماں مانگوں

جامۂ جسم سے کرنے کا نہیں دستِ جنوں
پیرہن خاک میں دیوانۂ عریاں مانگوں

بختِ واژوں نے زباں کو یہ اثر بخشا ہے
تلخی مرگ مزہ دے جو نمکداں مانگوں

کب سے در پر ترے سائل ہوں میں آتش کی طرح
وہ ملے مجھ کو جو کچھ اے شہِ خوباں مانگوں

(۱۶) گویا ۱۸۳۸ء

نواب فقیر محمد خاں گویا واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا زمانہ پایا تھا صاحبِ دیوان تھے ان کا دیوان ۱۲۴۲ھ میں مرتب ہو چکا تھا لیکن اس کے طبع کی نوبت ان کی وفات کے بعد آئی سب سے پہلی مرتبہ اس کو ۱۸۸۱ء میں مطبع نولکشور نے کانپور میں چھاپا تھا ۱۸۵۰ء مطابق ۱۲۶۶ھ میں انتقال ہوا غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

(۵۱) غزل

پھر یہ دل شیفتۂ زلفِ پریشاں ہوگا
پھر مرا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا

اے جنوں پھر مجھے خوش آنے لگی عریانی
پھر نہ دامن ہی رہے گا نہ گریباں ہوگا

پھر بہار آئی ہوا جوشِ جنوں پھر مجھ کو
چاک پھر گل کی روش میرا گریباں ہوگا

پھر ہوا شوقِ شہادت مجھے پھر ہوں گا شہید
پھر گلا میرا تہِ خنجرِ براں ہوگا

پھر لگی لالہ رخوں سے مجھے الفت ہونے
سینہ پھر داغوں سے مانندِ گلستاں ہوگا

پھر چلینگے ترا قامت دیکھ کے گلزاروں میں
پھر ہر اک سروِ چمن سروِ چراغاں ہوگا

پھر ترے قد کا خیال آنے لگا گلشن میں
نخلِ ماتم مجھے پھر سروِ گلستاں ہوگا

پھر کسی آئنہ رخسار سے الفت ہو گی
صورتِ آئنہ پھر دل مرا حیراں ہوگا

چاہ پھر تیری جھنکا گی کنوئیں ای یوسف
پھر یہ دل شیفتہ چاہِ زنخداں ہوگا

پھر لکھوں گا تری رفتار کی خط میں تعریف
نامہ بر پھر مرا یہ کبکِ خراماں ہوگا

گھر میں دل پھر مرا گھبرانے لگا آپ سے آپ
ای جنوں پھر یہ مکاں خانۂ زنداں ہوگا

پھر ہوا عشق ترے ناوکِ مژگاں سے مجھے
پھر عوضِ دل کے مرے سینہ میں پیکاں ہوگا

یاد پھر یار کی تڑپائے گی بجلی کی طرح
ابر پھر ساتھ مرے اتوں کو گریاں ہوگا

پھر مرے نالوں سے ہو جائے گا محشر برپا
چاک پھر صبحِ قیامت کا گریباں ہوگا

پھر خوش آتی ہے مرے دل کو شبِ ماہ کی سیر
عشق پھر چاند سے مکھڑے کا دوچنداں ہوگا

پھر ہوا جوشِ جنوں جاؤں گا پھر صحرا کو
پھر ہر اک آبلے میں خارِ مغیلاں ہوگا

مجھ سے پھر مرنے پہ خوش چشم کریں گے کاوش
سبزہ پھر قبر کا پامالِ غزالاں ہوگا

پھر طبیعت مری آنے لگی اک کافر پر
پھر نہ دل ہوگا نہ دیں ہوگا نہ ایماں ہوگا

پھر مزہ عشق کا چکھیں گے مرے زخمِ جگر
ہاتھ میں پھر مرے قاتل کے نمکداں ہوگا

ان دنوں پھر تجھے گویا ہی جو چپکی سی لگی
پھر ارادہ طرفِ ملکِ خموشاں ہوگا

(۱۷) مومن ۱۸۰۰ء–۱۸۵۲ء

حکیم مومن خاں ولد حکیم غلام نبی خاں دہلوی خاندانی شریف اور طبیب تھے ان کے اسلاف کشمیر سے دہلی آئے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں موضع بلاہہ پرگنہ نورنول (پنجاب) میں انہیں جاگیر عطا ہوئی تھی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد تھے مگر تھوڑے دنوں بعد انہیں اپنا کلام دکھانا چھوڑ دیا اور ایسی مشقِ سخن بڑھائی کہ خود استاد ہوگئے وارفتہ طبیعت عاشق مزاج آدمی تھے. نازک طبع عالی خیال تھے غزل کے علاوہ قصائد میں بھی ان کا خاص رنگ تھا اور مثنوی میں تو وہ رنگ اختیار کیا ہے جو بے مثل ہے ان کا تخیل اعلےٰ درجہ کا ہے غالب کے کلام کی طرح ان کا کلام بھی ابھی پرانا نہیں ہوا. جب پڑھیے نیا لطف آتا ہے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء کو کوٹھے سے گر کر ۵۲ سال کی عمر میں جوان فوت ہوئے مہندیوں کے قبرستان میں دہلی کے مرحوم محدثین کی حریم کے باہر مشرقی دیوار کے زیر سایہ دفن ہیں. دیوان موجود ہے.

(۵۲) قطعہ

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے — کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں — جو تھا سو اس کو دیکھ کے نادار و زار تھا
عبرت کی جا ہے اُن صنموں نے کیا خراب — ملنے سے جن کے معتقد ننگ و عار تھا
بیمار کر دیا تپِ ہجرِ بتاں نے آہ — کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا
یا تو ہمیں ڈراتے تھے خورشیدِ حشر سے — یا اپنے سر پہ داغِ جنوں شعلہ بار تھا

اختر شماریِ شبِ غم نے بھلا دیا
جتنا خیالِ پرسشِ روزِ شمار تھا

ہر ایک کی طرف نگہِ بے کسانہ تھی
کس کی نگاہِ لطف کا امیدوار تھا

ہمت سے اور نازہ اٹھانے کی آرزو
باقی تھی گو کہ ضعف سے جینا بھی بار تھا

ہر دم ہوائے آہ سے اڑتی تھی منہ پہ خاک
جتنی کہ سر میں گرد تھی دل میں غبار تھا

زخموں میں بس کہ مشک بھرا تھا میں کیا کہوں
عالم بدن کا ان کے عجب لالہ زار تھا

(۵۳) غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پہ
مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ! ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا بات میں نے وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اُتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا ۔ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے با وفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۵۴)

دفن جب گور میں ہم سوختہ ساماں ہونگے
ناوک ناز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے

فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کرکے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

بہت تر دل صد چاک سے الجھی تھی ۔ تمہاری زلف کا شانہ نے بل نکال دیا ۔ (فراق)

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا
اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسےٰ نہ اُٹھائینگے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گل نہ ہوں گے شررِ آتش سوزاں ہوں گے

غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اُس کے سگِ کوچہ کے قرباں ہوں گے

داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(۱۸) تسکین ۱۸۵۱ع

میر حسین ولد میر حسن عرف میرن صاحب ان کا سلسلۂ نسب میر حیدر خاں تک پہنچتا ہے جو حسین علی وزیر فرخ سیر کا قاتل تھا حضرت تسکین ۱۲۱۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے فارسی مولوی امام بخش صاحب صہبائی دہلوی سے پڑھی ابتدا میں شاہ نصیر دہلوی کو اپنا کلام

دکھاتے رہے پھر حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ معاش کی تلاش میں کچھ دنوں تک لکھنؤ میرٹھ وغیرہ قیام رہا پھر رامپور میں ملازم ہوگئے اور سنہ ۱۲۶۶ھ میں وہیں انتقال کیا پچاس سال کی عمر پائی اُنھوں نے شاہ نصیر مرحوم کا دیوان ترتیب دے کر اُردو کی ادبی دُنیا پر بڑا احسان کیا ہے۔ ترکیب بندش اور میدان تخیل میں اپنے اُستاد کے نقش قدم پر چلتے تھے ان کا دیوان نایاب ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۵۵) غزل

کرسکے دفن نہ اُس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس
نہ دیئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی
بات تو کرنے دے اے تپش دلِ بیتاب مجھے

نام تسکیں پہ یہ مضمونِ تپش نا زیبا
تھا تخلص جو سزاوار تو بیتاب مجھے

(۱۹) وزیر سنہ ۱۸۵۴ء

خواجہ محمد وزیر لکھنوی خلف خواجہ محمد فقیر۔ آپ خواجہ بہاءالدین نقشبندی کی اولاد میں تھے حضرت ناسخ کے تلامذہ میں مامور تھے۔ کلام میں حسن و عشق کے ساتھ اخلاق اور تصوف کی چاشنی موجود ہے سب سے پہلے آپ کا دیوان سنہ ۱۲۷۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے چھاپا تھا اس کے بعد دوسری جگہ طبع ہوا عام طور پر بازاروں میں ملتا ہے۔ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء

میں وفات پائی. خواجہ صاحب کی یہ غزل زبان زدِ خلائق ہے.

(۵۶) غزل

چلا ہے اے دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمیں کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اس نے موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

بناوٹ نے بگاڑا اب نہیں سنتے ہیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں لگا کر تیغ پر لب اس نے جب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

جوابِ نامہ کیا لایا تنِ بیجاں میں جاں آئی
گیا یاں سے کبوتر واں سے آیا مرغِ جاں ہو کر

کہیں گم زندہ در گور ای و زیرِ اشبہ تو نہ بیا ہی
کیا ہی میں نے پیدا سنگِ قد سخت جاں ہو کر

(۲۰) ذوق ۱۸۵۵ء

شیخ محمد ابراہیم ولد شیخ محمد رمضان دہلوی ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوئے. شاہ نصیر کے شاگرد تھے. اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے ۱۹ سال کی عمر میں خاقانی ہند کا خطاب دے کے اپنے دربار کا ملک الشعرا بنا دیا. ابو ظفر بادشاہ ولیعہدی کے زمانے میں ہی ان کے شاگرد ہو گئے تھے کلام میں عاشقانہ معاملہ بندی اور رندانہ مضامین کی شوخی کی بہ نسبت متانت زیادہ ہے.

زبان کی صفائی محاورہ بندی اور بندشوں کی چستی کا ان کو خاص خیال ہے غزلوں میں مختلف مواقع پر ضرب الامثال کو نظم کرنا انھیں کا حصہ ہے ان کے قصائد خاص طور پر ممتاز ہیں ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء کو انتقال کیا پروفیسر آزاد نے لکھا ہے کہ مرنے سے تین گھنٹے قبل یہ شعر تصنیف کیا تھا ؎

	کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے	

ان کا ایک مختصر دیوان اردو جسے حافظ غلام رسول ویران نے ۱۲۶۹ھ میں ترتیب دیا تھا عام طور پر رائج ہے سنہ ۱۸۹۰ء سے کچھ قبل اس دیوان کو بہت سی غزلوں اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ پروفیسر آزاد نے ترتیب دیا جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

غزل (۵۷)

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں رنگِ لعلِ غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
ادھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

(۵۸)

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام
اژدر کوئی انساں کو نگل جائے تو اچھا

اگر تو یہ رکھے مرے تنِ خشک کو غرقاب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیرِ محبت تو عجب حُب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

فرقت میں تری تارِ نفس سینے میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمرِ نخلِ محبت
سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

ق

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہیں ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

(۵۹)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہم سا بھی اس بساط پہ کم ہوگا بد قمار
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پہ کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمر خضر بھی تو ہو معلوم وقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

(۶۰)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگِ جراحت والے

گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اُٹھیں نہ ترے متوالے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا لبِ جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
ہائے نکلے حسرتِ دیدار مری جائے کو بھی
نہیں جز شمع مجاور مری بالینِ مزار
نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ
دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے دل کچھ کہتا
تو جو آجائے تو اے دردِ محبت کی دوا
چھوڑ دیتے ہیں قلم جب قلمِ آتشباز
کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
تو مرے حال سے غافل ہے بڑی غفلت کیش

تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے
دیکھو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے
دونوں اک حال میں ہیں رنج و مصیبت والے
میرے ہمدرد ہوں بیدرد نصیحت والے
میری شرحِ تپشِ دل کی کتابت والے
دل بیمار کے ہیں وہی عیادت والے
تیرے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

نازہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۲۱) صبا ۱۸۵۵ء

میر وزیر علی ولد میر بندہ علی لکھنوی خواجہ آتش کے ممتاز شاگردوں میں تھے عاشقانہ رنگ میں مزیدار شعر لکھتے تھے۔ آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔ ان کو حضرت واجد علی شاہ کے یہاں سے دو سو (۲۰۰) روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۶۱)

ای صبا جانبِ چمن وہ دلِ ناشاد آیا
میرے آغوش میں اُڑ کر وہ پری زاد آیا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

بن گیا خالِ جبیں کوکبِ بختِ خورشید
کس ترقی پہ ترا حسنِ خداداد آیا

(۶۲)

شور جس کا ہے وہ ہے عشقِ جنوں زا دل میں
بڑھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجیے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

عرصۂ حشر میں ہوگا گزری کا عالم
لے نہ جانا کہیں دنیا کا بکھیڑا دل میں

چھا گیا لیجیے بڑھ کر چمنِ ہستی پر
نخلِ الفت کا لگایا تھا ذرا سا دل میں

ای صبا جس کے لیے ہوں میں پریشاں خاطر
جانتا ہے وہ مجھے گیسوؤں والا دل میں

(۶۳)

مغتنم ہے باغِ عالم کی ہوا دو چار دن
صورتِ گل ہے یہاں نشو و نما دو چار دن

سبزۂ خط کا نمو ہے چاند سے رخسار پر
اور رخ پر چھوڑ تو زلفِ دوتا دو چار دن

او بتِ کافر ہے اللہ رے بے پروائیاں
آشنا دو چار دن نا آشنا دو چار دن

دعائے وصل سن کر وہ صنم کہنے لگا
بیٹھ کر مسجد میں کر یادِ خدا دو چار دن

مجھ گریباں چاک کے مرنے سے اک وحشت ہے
وا رہے اس شوخ کے بندِ قبا دو چار دن

روز آتی ہے لبِ گورِ غریباں سے صدا
شادی و غم ہے پئے شاہ و گدا دو چار دن

نکہتِ گل پھر کہاں بادِ بہاری پھر کہاں
دام پیدا کیجیے جی ہو چکی مفلس ہوئے
باندھ لے اے باغباں اپنی ہوا دو چار دن
بیٹھیے مسجد میں بن کر پارسا دو چار دن

بادۂ گلگوں چلے ہر روز چل کر باغ میں
موسم گل کے یہی ہیں اے صبا دو چار دن

(۲۲) رند ۱۸۵۷ء

نواب سید محمد خاں فرزند نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری ان کے والد پہلے فیض آباد میں رہتے تھے پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ رند ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے جب تک وہاں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق والد میر انیس کو دکھایا۔ لکھنؤ میں آکر آتش کے شاگرد ہو گئے۔ اُردو شاعری میں قفس۔ صیاد۔ آب و دانہ گرفتاری وغیرہ کے مضامین ان کا حصہ ہیں ۱۸۵۷ء میں غدر سے کچھ دنوں قبل انتقال کیا دیوان ہر جگہ ملتا ہے۔ یہ غزل زبان زد خاص و عام ہے

(۶۴) غزل

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاجداں صیاد

دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں ہم کہاں کہاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اُڑ جاؤں گا کہاں صیاد

الٰہی دیکھیے کیوں کر نباہ ہوتا ہے
زبانِ راز ہوں میں اور بے زباں صیاد

ہے نہ قابلِ پرواز بال و پر میرے
قفس سے اُڑ کے میں اب جاؤں گا کہاں صیاد

قفس پہ کھلنے لگا اب تو ہا پھولوں کے
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

فریبِ دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رند
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

(۶۵)

جو پہ آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

شان ارفع ہے تری، مرتبہ اعلیٰ تیرا
تو ہے یکتا، کوئی ثانی نہیں حقا تیرا

ایک عالم کو ترے نام کا ہے ورد اے دوست
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا

دیدۂ لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں
سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا

تو ہی نے اس کو بنایا ہے یدِ قدرت سے
تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

عاشقِ روئے پری شیفتۂ حور نہیں
جانِ جاں رند ہے دیوانہ و شیدا تیرا

(۲۳) اختر ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء

ملک الشعرا قاضی محمد صادق خاں ولد قاضی محمد لعل ہگلی (ملک بنگال) کے قاضی زادوں میں تھے مگر علم پرستی اور ذوق سخن نے ان کو وطن چھڑا کر لکھنو رہنے پر مجبور کیا میرزا قتیل کے عقیدتمند شاگرد تھے۔ فارسی۔ اردو۔ دونوں زبانوں میں شعر لکھتے تھے آپ نے ایک تذکرہ آفتاب عالم تاب کے نام سے مرتب کیا تھا جس میں پانچہزار شعرا کا حال اور انتخاب درج تھا۔ غازی الدین حیدر والی لکھنو نے ان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں وفات پائی صبح صادق نور الانشا۔ محامد حیدریہ دیوان فارسی۔ دیوان ریختہ۔ آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کا مصنفہ تذکرہ آفتاب عالم تاب نایاب ہے آپ کا یہ قطعہ نہایت مشہور ہے۔

(۶۶) قطعہ

گل بن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا
دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا

کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر کو پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجے جو آپ مجھ کو نہ مورد عتاب کا

تقوی جہاں سے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

می ہو سبو کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش
اور وہاں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی ہے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ
یہ پیش جس پہ جلوہ ہو رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جائے جلد یہ ساغر شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں نہیں تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہو قبلہ کسی شیخ و شاب کا

(۶۷)

عجب ڈھب صبا کی یہ تعمیر خراب آباد ہستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے بلندی یاں کی پستی ہے

تمد کیوں نہیں اے ساکنانِ ملکِ ہستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے

ہر اک دل میں ہیں آئے پیری ہے نفس کافر کی
خدا کے گھر میں ہے دیکھیے کیا بت پرستی ہے

حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعی باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

گلوں کا ہے گریباں چاک سیتی ہے صرصر ہے
صبا مضطر سی ہے اور گٹھریاں غنچوں کی کستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اخترؔ
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

(۲۴) امانتؔ ۱۸۵۹ء

سید آغا حسن خلف میر آغا حسین رضوی لکھنوی۔ آپ سید علی رضوی کی اولاد سے تھے ۱۲۳۱ھ میں حضرت امانت کی ولادت ہوئی فنِ شعر میں دلگیر لکھنوی مشہور مرثیہ گو سے استفادہ

حاصل کیا۔ ابتدا میں معمے او رچیستاں کہنے کا شوق ہوا مگر اس فن میں پورے نہ اُترے تو دیگر اصنافِ سخن کی طرف توجہ فرمائی۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت کے عاشق تھے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی صنائع و بدائع کو شاعری کا اصلی جوہر سمجھتی تھی اس میں آپ نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ یوں تو آپ صاحبِ دیوان ہیں جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں مرثیہ گوئی میں بھی اپنی طباعی دکھائی ہے لیکن ان کی اندر سبھا کو اُردو لٹریچر میں جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کہنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ آپ نے اُردو زبان میں اس کتاب کو لکھ کر سب سے پہلے ڈرامے کی بنیاد ڈالی ہے اُردو متقدمین میں اس نمونہ کی ایک نظم بھی نہیں ملتی۔ حضرت امانت نے ۸ رجمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ کو وفات پائی۔

دیوان طبع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:-

غزل (۶۸)

بھولا ہوں میں عالم کو سرشار اسے کہتے ہیں — مستی سے نہیں غافل ہشیار اسے کہتے ہیں

کل گھر سے جو وہ نکلا اک شور ہوا برپا — دل بس گئے عالم کے رفتار اسے کہتے ہیں

تصویر کو سکتہ ہے کہتے ہیں اسے نقشہ — آئینے کو حیرت ہے رخسار اسے کہتے ہیں

اک رشتۂ الفت میں گردن ہے ہزاروں کی — تسبیح اسے کہتے ہیں زنار اسے کہتے ہیں

دل نے شبِ فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا — مونس اسے کہتے ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں

اک قطرہ نہیں مے کا میخانہ میں ہے ساقی — خم کر دیے سب خالی مے خوار اسے کہتے ہیں

دل ہجر کی شب غش ہے بیدار ہے چشم اپنی — بے ہوش اسے کہتے ہیں ہشیار اسے کہتے ہیں

	خاموش امانت ہی کچھ اف بھی نہیں کرتا کیا کیا نہیں ای پیارے اغیار اسے کہتے ہیں	

(۲۵) نسیم ۱۸۴۰ء

منشی دیاشنکر لکھنوی ولد گنگا پرشاد پنڈت کشمیری آپ خواجہ آتش مرحوم کے شاگردوں میں تھے مثنوی گلزارِ نسیم آپ کی مشہور تصنیف ہی جو ۱۸۳۳ئہ میں نظم کی گئی تھی گو اس کا پلاٹ ہندی کے ایک پرانے قصہ سے لیا گیا ہی مگر ادائے بیان نہایت دلکش ہی چھوٹی بحر اور مختصر الفاظ میں اہم مضامین ادا کیئے گئے ہیں حال میں مثنوی گلزار نسیم و میر حسن کے متعلق بابو برج نراین چکبست اور مولوی عبد الحلیم شرر کے درمیان مباحثہ ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں دونوں مثنویوں پر فن تنقید کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ اس مثنوی کے علاوہ نسیم کا ایک دیوان بھی ملتا ہی مثنوی کا انتخاب یہ ہی۔

(۶۹) آوارہ ہونا بکاؤلی کا تلاشِ گل میں

گل کا جو الم چمن چمن ہی	وہیں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہی
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا	اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام	یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے	اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی	پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا. کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
گلچیں کا جو ہاتھ ٹوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل
او باد صبا ہوا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے

کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے نے مجھے خار دے گیا کون
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
سوسن تو بتا کدھر گیا گل
شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا
بیگانہ نہ تھا سبزے کے سوا کون
اوپر کا تھا کون آنے والا
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
خوشبو ہی سنگھا. پتا نہ بتلا
گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

(۲۶) ظفر سنہ ۱۸۶۲ء

محمد سراج الدین نام خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے۔ ولی عہدی میں ابو ظفر خطاب تھا

بہادر شاہ کے لقب سے اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کے جانشین ہوئے تاریخ پیدائش ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ اور ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو تخت پر بیٹھے مدت زمانہ ولیعہدی سے شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے ابتدا میں شاہ نصیر اور پھر خاقانی ہند ذوق دہلوی کے شاگرد ہوئے علمی قابلیت کے سوا فطری شاعر تھے غدر ۱۸۵۷ء کا منحوس واقعہ انہیں کے زمانہ میں جبکہ بادشاہی حکومت صرف دہلی میں ایک محدود رقبہ کے اندر باقی رہ گئی تھی پیش آیا تھا غدر کے فرد ہونے کے بعد ۱۸۵۸ء میں برٹش گورنمنٹ نے ان کو نظر بند کرکے کلکتہ بھیجدیا تھا وہاں سے رنگون کو منتقل ہوگئے اور اپنی عمر کے بقیہ انفاس وہیں گزار دیئے شاعری کا شغل وہاں بھی جاری رہا سوز و گداز ناکامی و نامرادی کی درد بھری داستانوں کو مختصر الفاظ میں نظم کرنا انہیں کا حصہ تھا اور ظفر جیسے بدنصیب تاجدار کے جسے اپنے جلیل القدر اسلاف کی مٹی ہوئی یادگاروں پر آخری نظر حسرت ڈال کر دہلی سے نکلنا نصیب ہوا ہو جسے گزشتہ اقبال و جاہ و جلال کے خرابوں پر گہری نظر ڈالنے کا موقع ملا ہو دماغ سے اس قسم کے خیالات نکلنے کے سوا دوسرے مضامین کی تلاش کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی انہوں نے چار دیوان چھوڑے جو مشہور عالم ہیں بمقام رنگون ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۹ھ کو وفات پائی۔

(۷۷) غزل

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور شہر خموشاں ہے
جہاں اب خاک پر ہیں نقش پائے آہوئے صحرا

کبھی کیا کیا نہ ہنگامے تھے یاں پر شور و شر یاں تھے
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظر یاں تھے

ظفرؔ احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں باغ پر کیا کیا پیشتر یاں تھے

(۷۱)

یا مجھے افسرِ شاہانہ نہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا۔ نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دل صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلفِ مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائق صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دورِی ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ مے خانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

(۷۲)

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

وہم مسلسل ای بتِ عشوہ گر خوشی عید کی سی ہوئی مجھے
خم تیغ تیرا جو سامنے نظر آیا مثلِ ہلال تھا

کہو اس تصورِ یار کو کہوں کیوں نہ خضرِ خجستہ پے
کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہونگا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے
وہ جب آ گیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہے بے وفا وہ ہے پُر جفا وہاں لطف کیا و فا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امر محال تھا

پسِ پردہ سن کے تری صدا ترا شوق دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھٹ کے جو جستجو کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قیدِ خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

(۷۳)

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اُس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کونسی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا
ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
کئی روز میں آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا
ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا
مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو کے خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا
اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُس کو نہ جانیئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(٢٧) نسیم دہلوی ۱۸٦۲ء

نواب اصغر علی خاں دہلوی خلف نواب آغا علی خاں۔ آپ مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ سے تھے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ عربی فارسی میں کافی استعداد تھی فن خوشنویسی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کے کلام میں نازک خیالی مضمون آفرینی کے سوا زبان کی خوبیاں اور سادگی کا لطف بھی موجود ہے ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸٦۲ء میں وفات پائی الفالیلہ نظم اور دیوان آپ کی یادگار ہے کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(٧٥) غزل

عروسِ فکرِ رنگیں کو خیال آیا جو تزئیں کا
شگافِ خامہ شانہ بن گیا زلفِ مضامیں کا

بلا ٹلتی ہے بخشش سے بہا اے چشمِ تر آنسو
ملے کچھ دامنِ خالی کو صدقہ روحِ غمگیں کا

بہار آئی جھکائے سر گلوں نے کیفِ مستی سے
پڑا ہو گردنِ ہر شاخِ تر میں ہاتھ گلچیں کا

بشکلِ مرغِ بسمل اور بڑھ جاتی ہے بیتابی
دلِ مضطر کو طعنہ ہو گیا ہے نامِ تسکیں کا

وہ سرعت دی ہے دعا کو مطلبِ بیتاب نے میرے
کہ برسوں قافلہ ڈھونڈا کیا فریاد آمیں کا

نسیم اب قبلہ روائی اشتیاقِ سامعیں پر ہے
دکھایا لطف ہم نے ہر طرح سے طبعِ رنگیں کا

(٧٦)

فصلِ گل آئی ہے کل دیکھیے کہاں ہوں گے
میرے دامن ہیں ترے دستِ گریباں ہوں گے

سب کافر ہیں حسینوں کی نہ سن تو اے دل چار دن بعد یہی دشمنِ ایماں ہوں گے
شکر ہو جائیں گے انجام کو اپنے شکوے رنج کے خوف سے ہم ان کے ثنا خواں ہوں گے
کھینچیے تیغ تامل ہے یہ کیوں بسم اللہ سر جھکا دیں گے جو یاں بندۂ احساں ہوں گے
کس طرح جائیں گے مانع ہے ہمیں خوفِ مزاج زلف پر خم ہے تو کچھ وہ بھی پریشاں ہوں گے
شوخیاں کر لے جنوں آج بیاباں پر کل تو خاک اُڑ جائے گی زمیں دشت ویراں ہوں گے
گر یہ انجامِ تبسم ہے نہ ہنس اے غافل خون روئیں گے وہی زخم جو خنداں ہوں گے
یاد آئے گا پسِ مرگ ہمارا یہ کمال حال کھل جائے گا جب خاک میں پنہاں ہوں گے
تجھ کو کر دیں گے خبر زیرِ لحد سونے کی سر پٹکتے ترے زیرِ مرے ارماں ہوں گے
خانہ زادِ دل کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ ہم وہ بلبل ہیں یہیں خاکِ گلستاں ہوں گے
دم نکل جائے گا گر ہاتھ لگا اے جراح وہ نہیں زخم جو شرمندۂ احساں ہوں گے

دو یہ ہر نخل کریں گے صفتِ گر نہ تسنیم
ہم پسِ مرگ بھی قربانِ گلستاں ہوں گے

(۲۸) ناظم ۱۲۶۵ھ

نواب محمد یوسف علی خاں فردوس مکان خلف نواب محمد سعید خاں بہادر والی رام پور آپ ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ کو مسند نشین ہوئے نواب صاحب مرحوم علوم عقلیہ کے ماہر منطق و فلسفہ سے باخبر تھے طبیعت کو شاعری سے خاص طور پر مناسبت تھی پہلے حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے

مشورۂ سخن رکھتے تھے اس کے بعد میرزا غالب کے شاگرد ہو گئے اسی زمانہ میں عاشقانہ دیوان مرتب ہو کر مطبع حسنی رام پور میں طبع ہوا تھا ۲۱ اپریل ۱۸۶۹ء مطابق ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی انتخاب کلام یہ ہے۔

(۷۷) دنیا کی بے ثباتی

کیا ہوا سروِ قدو؟ اب وہ تمہارا خم و چم
کیا ہوا لالہ رنگو ؟ اب وہ تمہارا عالم
کہو کیوں چھوٹ گئی مشقِ جفا کاری کی
کہو کیوں ٹوٹ گیا سلسلۂ جور و ستم
کھینچتے کیوں نہیں اب میاں سے تم خنجرِ ناز
دیکھتے کیوں نہیں اب تیغِ ادا کا دم خم
کچھ نہ عشاق سے مطلب ہے نہ اغیار سے کام
نہ اِدھر چشمِ غضب ہے نہ اُدھر چشمِ کرم
چین کیوں کر تمھیں آغوشِ لحد میں آیا
تم تو آغوشِ تصور میں بھی لیتے نہ تھے دم
کیا گزرتی ہے تہِ خاک تمہارے سر پر
فرش پر تم تو نزاکت سے نہ رکھتے تھے قدم
نازنینو!، وہ نزاکت کہو کس نے لے لی؟

سچ بتاؤ تمھیں اپنی ہی نزاکت کی قسم
صحن تک تھا تمھیں دالان سے آنا منزل
کس طرح طے ہوئی راہِ سفرِ ملک عدم
نازو انداز و ادا عشوے کرشمے ۔ غمزے
خاک میں مل گئے سب ہائے ستم ہائے ستم
ہائے وہ ابروئے خمدار وہ مژگانِ دراز
ہائے وہ چشم فسوں گر کی ادائیں پیہم
ہائے وہ چینِ جبیں شوخی و انداز کے ساتھ
ہائے وہ ناز سے تیور کا بدلنا ہردم
ہائے وہ شعلۂ رخسار کی غصے میں بھڑک
ہائے وہ گیسوئے پرپیچ کا ہونا پرخم
ہائے وہ فتنہ جگانے کی روش سے چلنا
ہائے وہ چھاگلیں پہنے ہوئے پھرنا چھم چھم

وا دریغا نہ رہی ایک بھی صورت باقی
بہرِ عبرت ہے زبانوں پہ حکایت باقی

(۲۹) رشک ۱۸۶۷ء

میر علی اوسط خلف میر سلیمان۔ آپ فیض آباد کے باشندے تھے۔ شاعری میں حضرت ناسخ لکھنوی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ محاورات کی چھان بین الفاظ کی تحقیقات کا شوق تھا۔ پختہ گو اور محقق مشہور ہیں۔ تاریخ گوئی میں اچھی مہارت بہم پہونچائی تھی۔ صاحبِ دیوان تھے۔ اب دیوان کمیاب ہے۔ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں ۸۰ سال کی عمر پاکر انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

(۷۷) غزل

جو رنج نوشتہ میں ہے کیونکر نہ ملیگا	لکھوائیں گے نامہ تو کبوتر نہ ملے گا
جس رات نقاب اس مہِ کامل نے اُلٹ دی	تاروں کو نشانِ مہِ انور نہ ملے گا
ابرِ شبِ فرقت ہی بندھے آنسوؤں کا تار	اس طرح کا وقت اے مژہ تر نہ ملے گا
کاہیدگیِ جسم اگر یوں ہی رہے گی	ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا
انصاف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت	اے رشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

(۳۰) آزردہ ۱۸۶۸ء

مفتی صدر الدین خان خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے زمانہ کے علما و فضلا میں ممتاز تھے۔ ذوق

مومن۔ غالب۔ صہبائی کے ہمعصر و دوست تھے دہلی میں عہدہ صدر الصدوری کی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ جب مفتی صاحب کے اجلاس میں حضرت غالب مرحوم نے یہ شعر بطور جواب پڑھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

انھوں نے اس شعر کو سن کر ان کے قرضہ کا روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ آپ نے ایک تذکرۂ شعرائے ریختہ بھی ترتیب دیا تھا جو اس زمانہ میں دستیاب نہیں ہوتا مفتی صاحب ایک جید عالم اور عربی زبان کے فاضل تھے۔ مگر نہایت صاف اور پر لطف شعر لکھتے تھے ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں رحلت فرمائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

(۷۸)

یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے ان کے حجاب میں
اچھے برے کا حال کھلے کیا نقاب میں

یارب وہ خواب حق میں مرے خواب مرگ ہو
آئے وہ مست خواب اگر میرے خواب میں

حال اس نگہ کا اس کے سراپا میں کیا کہوں
مور ضعیف پھنس گئی جا شہد ناب میں

یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب ہے
تو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

خورشید رہرو نے زمیں سے چٹکا فرا
تو آفتاب ہیں تری گرد نقاب میں

کیا عقل محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر
سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں

اٹھنے میں صبح کے یہ کہاں سر گرانیاں
زاہد نے مے کا علوہ دیکھا ہے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں قیس کیا
ہر ہر روش میں سخت قفس کے مرے ہی خوں چکاں
میں اور ذوقِ بادہ کشی؟ لی گئیں مجھے
امدادِ چشم کیا ہو لگے دل کو آگ جو
ہیں دونوں مثلِ شیشہ یہ سامانِ شکست

لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں
غوطے تو سو دیئے اُسے زمزم کے آب میں
یکم لگا ہیاں تری بزمِ شراب میں
جلنے کے بعد خوں نہیں رہتا کباب میں
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں بچتی تھیں عہدِ شباب میں

(۳۱) غالب ۱۸۶۹ء

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوئے شادی ہونے کے بعد میرزا صاحب نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور ۷۳ برس کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ کو انتقال کیا۔ جوار حضرت نظام الدین اولیا میں چونسٹھ کھمبا کے قریب ایک حریم میں دفن ہوئے فارسی کی نظم و نثر کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو انشاء پردازی کی طرز جدید کے بانی تھے ماہرین سخن کا قول ہے کہ ہندوستان میں شاعری کا آغاز امیر خسرو سے ہوا اور اس کا خاتمہ میرزا غالب پر ... تصنیف
ہیں علاوہ فارسی ...

۱۹۱۵ء میں ایک خاص اڈیشن نہایت اہتمام اور جلی قلم عمدہ کاغذ پر مع میرزا کے فوٹو کے نظامی پریس بدایوں سے شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں اسی پریس نے ایک عمدہ مشرح اڈیشن نکالا پھر اسی شرح نظامی کے ساتھ کئی پاکٹ اڈیشن شایع ہو چکے ہیں جن میں علاوہ میرزا کے فوٹو کے اُن کی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ اس اُردو دیوان کی شرح مولانا طباطبائی اور حسرت نے بھی لکھی ہے میرزا کا کلام آج کل کے تعلیم یافتہ گروہ میں نہایت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ اخلاقی اور فلسفی مسائل سے بھرا ہوا ہے اور ان کے تخیل میں وہ جدت پائی جاتی ہے جو کبھی پُرانی ہونے والی نہیں۔ غالب کی طبیعت کو بعض لوگ دُشوار پسند کہتے ہیں لیکن جہاں کہیں اُنھوں نے سلاست کو برتا ہے روانی کے دریا بہا دیے ہیں۔ اُردو زبان پر میرزا کا یہ بڑا احسان ہے کہ نثر میں مراسلے کو مکالمہ بنا کر خطوط نویسی کی ایک جدید طرز نکالی اور نظم میں ایسے اسلوب بیان کا نمونہ چھوڑا کہ ان کے نقش قدم پر چل کر موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ شعرا کو قدرت کے نقش و نگار سیاسی حالات فلسفی مسائل وغیرہ کا نظم کے ذریعہ سے ظاہر کرنا آسان ہو گیا۔ غالب کے حالات اور سوانح میں مولانا حالی کی مبسوط تصنیف یادگار غالب موجود ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۶۹) غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا ۔۔۔ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

[illegible] ۔۔۔ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۔ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو ۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۔ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ۔ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۔ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۸۰)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۔ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(۸۲)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(۸۳)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۸۴)

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۸۵)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا۔ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا؟ جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

(۸۶)

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

غرۂ اوج بنائے عالم امکاں نہ ہو
[illegible] نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

(۸۶)

سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں۔ دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں۔ یعقوب نے لی گو۔ نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں۔ روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش! کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو۔ کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا۔ کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اس کی ہے۔ دماغ اس کا ہے۔ راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہٴ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(۶۷)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم۔ غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں۔ ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز۔ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز۔ اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیئے ہائے ہائے کیوں

(۸۹)

غنچۂ ناشگفتہ کو۔ دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں ہیں۔ مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں
پرسشِ طرزِ دلبری کیجیئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پیئے۔ ساتھ رقیب کو لیئے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ کرے خدا کہ یوں
"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا تو دیکھیئے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا کہ یوں
بزم میں اُس کے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھیئے
اُس کی تو خامشی میں بھی۔ ہے یہی مدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
مجھ سے کہا جو یار نے۔ جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ وار بن گئی۔ حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال۔ وصل میں شوق کا زوال؟
موجِ محیطِ آب میں۔ مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

(۸۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

زید کہتا ہے کہ اس کا عزیز سے اخلاص حیف
عمرو کہتا ہے کہ وہ صبح مہر کسی کا آشنا -

جو منکرِ وفا ہو. فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں. خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

میں اور حظِ وصل خداساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ! دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

دنیا اور آخرت کی نعمت

(۹۰)

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

(۹۱)

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

(۹۲)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار		اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۹۳)

تپش سے میری. وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہی		مرا سر رنجِ بالیں ہی مرا تن بارِ بستر ہی
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ. نور العینِ دامن ہی		دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہی
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو جو تم آئے		فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہی
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی		شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہی
ابھی آتی ہی بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی		ہماری دید کو. خوابِ زلیخا. عارِ بستر ہی

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہی ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہی

(۹۴)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہی مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہی مجھ سے
خدایا جذبہ دل کی. مگر تاثیر اُلٹی ہی
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہی مجھ سے
وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہی مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہی. ادھر یہ ناتوانی ہی

نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ داماں خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھسے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۹۵)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے نزدیک
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے تیرا مرے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بت آئنہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا	کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر	کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام	مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے	آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو	آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے	رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۹۶)

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نَے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال	مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب	اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا	کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست	بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل	
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت	

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور، نہ جوشِ خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

(۹۷)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کس کی حاجت روا کرے کوئی

ب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کِسی کا گلا کرے کوئی

(۹۸) سہرا[۱]

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اِس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل اُفروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا

[۱] غالب نے یہ سہرا ابوظفر بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پر لکھا تھا مقطع کو سُنکر بادشاہ نے خیال کیا کہ مقطع میں اُن کے اُستاد ''ذوق'' پر تعریض کی گئی ہے چنانچہ بادشاہ کے اشارے سے اُستاد ذوق نے بھی اسی ردیف و قافیہ میں ایک سہرا لکھا جو اس کے بعد درج ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۹۰

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے لکھدے کوئی بڑھ کر سہرا

(۹۹) سہرا جو ذوق نے جواب میں لکھا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سُبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بھی ہیں یہ ہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھکر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اِک گُہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لیکے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طُرۂ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے ہٹاکر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بناکر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثناگر سہرا

جن کو دعوائے ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

(۱۰۰) قطعہ[۱]

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مُدّعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

[۱] ... نے اپنے سہرے کے جواب میں استاد ذوق کا سہرا سُن کر اس قطعے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا

(۳۲) ثاقب ۱۸۶۹ء

شہاب الدین خاں خلف الرشید نواب ضیاءالدین خاں متخلص بہ نیّر رئیس لوہارو۔ دہلی کے نامور رؤسا میں تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے عزیز تھے اور شاعری میں انھیں سے تلمذ تھا۔ آپ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق رکھتے تھے۔ فارسی۔ اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا غالب کو ان کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی بہ عالم جوانی ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اُن کے بیٹے نواب شجاع الدین خاں تاباں اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل اس وقت موجود ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۰۱) غزل

ہم قوتِ جاذبِ دل دکھائیں — اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں — کچھ حال سنو تو ہم سنائیں

اے بخت کہاں تلک برائی — اے چرخ کہاں تلک جفائیں

ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں — وہ شوق سے خنجر آزمائیں

جو کام ہیں غیر کے ہوں صرف — افسوس وہ دلربا ادائیں

شاید کہ ہو گرمِ نالہ ثاقب

چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

۱ انتقال ہوگیا۔

(۱۰۲)

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اٹھائیے
اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھائیے

بے لطف زندگی سے تو مرنا ہی بہ ہے
کیا فائدہ کہ نازِ مسیحا اٹھائیے

آؤ نہ آؤ ہم بھی ہیں خوگر شکیب کے
جی چاہتا ہے ذوقِ تمنا اٹھائیے

رکھتے ہیں لوگ خلوتِ دشمن کا اتہام
بے پردگی ہے یہ وہ ہو پردہ اٹھائیے

بیٹھے ہیں اب تو ہم دلِ بے آرزو لیے
وہ دن گئے کہ داغِ تمنا اٹھائیے

(۲۳) شیفتہ ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفٰے خاں خلف نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضٰے خاں بہادر رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر۔ آپ نواب ولی داد خاں مرحوم جانانان بنگش کی اولاد میں تھے ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مشہور معلمین اور کاملین سے عربی۔ فارسی پڑھی آپ کو علوم مروجہ میں اعلٰی درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ غدر سے پہلے دہلی میں مستقل سکونت تھی اور وہاں کی سوسائٹی سے بہرہ اندوز تھے ۱۸۵۷ء کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگے اور شاعری کو خیرباد کہہ دی۔ آپ اردو کی طرح فارسی میں بھی زبردست شاعر اور صاحب دیوان تھے اور حسرتی تخلص کرتے تھے حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے دیوان

ریختہ میں حکمت، تصوف، اخلاق، حسن و عشق کے جذبات اور فہم کے مضامین موجود ہیں اور ہر موقع پر سنجیدگی اور متانت کا خیال رکھا ہے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ میں آپ نے تذکرۂ گلشنِ بیخار مرتب کیا تھا جس میں اردو شعرا کے حالات اور کلام درج ہے۔ اردو زبان کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں شعرا کے کلام پر آزادانہ رائے بھی دی گئی ہے۔ آپ نے سنہ ۱۲۸۶ھ مطابق سنہ ۱۸۶۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی کلیات جس میں فارسی اردو کا کلام اور روایاتِ شیفتہ بزبان فارسی شامل ہیں مع مصنف کی سوانح عمری اور فارسی و اردو کے کلام پر ایک مبسوط تنقید کے مولانا نظامی بدایونی نے مرتب کیا ہے۔ جو نواب صاحب کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم کے ایما سے نظامی پریس بدایوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپ کر سنہ ۱۹۱۵ء میں شایع ہوئی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

غزل (۱۰۳)

ساقی کو میکدہ میں سرِ ناو نوش ہے
صوفی کو خانقہ میں سرِ وجد و حال ہے

عاشق کو اضطراب ہے عجز و نیاز سے
معشوق کو غرور ہے غنج و دلال ہے

منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت
حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہے کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے
ہر بات منطقی کی مرادِ جدال ہے

اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں
اہلِ کلام کو ہوسِ قیل و قال ہے

جن کو کہ دستگاہ ہے فنِ نجوم میں
عمر ان کی صرفِ زائچہ ماہ و سال ہے

ہیں بعض لوگ درپئے اسرافِ اندن
بعضوں کو روز و شب سرِ توفیرِ مال ہے

بعضوں کو ہی مذاق میں فخر نسب لذیذ
بعضوں کو ذوق دعویٔ فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریقِ بیمِ زوال ہے

جو ہیں مریضِ سیرِ چمن ان کو بزم میں
ذکرِ شجر کبھی کبھی فکرِ نہال ہے

جی میں کسی کے خواہشِ آرایشِ لباس
دل میں کسی کے حسرتِ جاہ و جلال ہے

کوئی طالب ہیں شہپرِ گلگوں نظیر کی
کوئی اسیرِ شوقِ شکارِ غزال ہے

کوئی فداے قامتِ آفت خرام ہے
کوئی خرابِ نرگسِ جادو مثال ہے

ناحق کسی کو شکوہ کسی کو شکایتیں
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

غزل (۱۰۴)

کل نغمہ گر جو مطربِ جادو ترانہ تھا
ہوش و حواس و عقل و خرد کا پتا نہ تھا

یہ بت کہ جانِ شیب ہے جب تھا نقاب میں
عہدِ شباب ان بتوں کا زمانہ تھا

معلوم ہے ستاتے ہو ہر اک بہانے سے
قصداً نہ آئے رات حنا کا بہانہ تھا

حسرت سے اس کے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھتے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا میکدے میں ہے کہ مدام ایں ہیں وہ نہیں
البتہ ایک حال دلِ بے مدعا نہ تھا

ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

کچھ آج اُن کی بزم میں ڈھنگ بے بست و بند و
آلودہ مے سے دامنِ بادِ صبا نہ تھا

دشمن کے فعل کی نہیں توجیہ کیا ضرور — تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

کل شیفتہ سحر کو عجب حالِ خوش میں تھے
آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا

(۱۰۵) قطعہ

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز — تلوّن سے ہے تم کو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں — کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا
کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں — کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں — کبھی الطافِ جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جانگزا کیوں — کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی — کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا — کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہرِ تسکیں — یہ ہم جلوہ ہائے دل ربا کیا
یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف — جواب اِک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

(۴۴) شوق ۱۸۷۱ء

حکیم تصدق حسین خاں صاحب۔ نواب میرزا آغا علی خاں لکھنوی صاحب تذکرہ سخن شعرا نے اُن کو آتش کا شاگرد لکھا ہے اس کے سوا اور کوئی تحقیق نہیں۔ زہر عشق۔ بہار عشق فریب عشق۔ لذت عشق کے مصنف تھے۔ ان مثنویوں کو تصنیف ہوئے قریب ۶۰ سال کے گزرے۔ مثنوی زہر عشق کا سال تصنیف سنہ ۱۲۷۷ھ (غم دلربا) سے برآمد ہوتا ہے۔ طرز بیان سلیس ہے لکھنؤ کے محاورات۔ روزمرہ۔ بول چال۔ ضرب الامثال کے ساتھ ہی ساتھ جذبات کی تصویر خوب کھینچی ہے۔ ان سب مثنویوں میں زہر عشق اپنے واقعہ کے لحاظ سے زیادہ دل گداز ہے۔ ایک موقعہ پر اس میں دنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ دکھایا ہے خوب ہے تقریباً ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔ زہر عشق کا انتخاب یہ ہے:-

(۱۰۶)

اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
گو بھڑکانے نہیں ہیں ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حور مہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم — ہوے جا جا کے زیر خاک مقیم
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کونسی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خودسر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — کبھی دھوپ میں نہ نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی ان کا نہیں نشان قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتا — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا

بوئے الفت تمام پھیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان
موت سے کس کو رستگاری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا
جا کے رہنا نہ اس مکاں سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی
روکے رہنا بہت طبیعت کو
ضبط کرنا اگر ملال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر
سامنا ہوگا ہزار آفت کا

باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
آج وہ کل ہماری باری ہے
موت عینِ حیات ہے اس میں
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
یا مری قبر پر چلے آنا
ہم جو مر جائیں تیری جاں دوڑے
ڈھونڈتے کس طرف کو جائے گی
یاد رکھنا مری وصیت کو
میری رسوائی کا خیال رہے
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
دور پہنچے گی میری رسوائی
لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
پاس رکھنا ہماری عزت کا

جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں	آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیے گا	بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا	نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا	ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے	سب ہیں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں	منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے	تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے	تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا	میری عزت نہ یوں ڈبو دینا
رنج فرقت مرا اٹھا لینا	جی کسی اور جا لگا لینا
رنج کرنا نہ میرا میں قربان	سن لو گر اپنی جان ہے تو جہان
دل ہٹی تھا نہ مجھ سے چھوٹ کے تم	جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تم
آکے رو لینا میری قبر کے پاس	تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا	قبر میری سے گلے لگا لینا
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر	پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا	پھول تربت پہ وہ چڑھا جانا
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے	مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہی کبھی آجائے گر ہمارا دھیان دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال مرگ کا کس کو انتظار نہیں	کون صاحب کسی کا ہوتا ہی جاننا ہم پہ ہو گئی قربان خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

(۳۵) نظام ۱۸۷۲ء

سید نظام علی شاہ خلف احمد سعید شاہ۔ آپ ریاست رامپور کے سادات سے تھے۔ آزادمنش آشفتہ مزاج۔ رندانہ طبیعت رکھتے تھے۔ عاشقانہ معاملات کو خوب لکھتے تھے۔ ابتدائی کلام میں شیخ علی بخش بیمار کو دکھایا۔ پھر نواب رامپور یوسف علی خاں بہادر ناظم سے اصلاح لی ۵ ۲ شعبان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء کو وفات پائی۔ دیوان مرنے کے بعد ریاست رامپور میں شایع ہو چکا ہی۔ نمونہ کلام یہ ہی:-

(۱۰۰) غزل

جو سر گزشت اپنی ہم کہیں گے۔ کوئی سُنے گا تو کیا کرینگے
جو یاد آئیں گی تیری باتیں تو پہروں چپ ہی رہا کریں گے
الٰہی قاصد ابھی نہ آئے کہ یہ توقع بھی ہی غنیمت
کیا گر انکار صاف اُس نے تو دل کو تسکین کیا کریں گے

عبث یہ ہر دم کا جھونکنا ہی عبث یہ اُٹھ اُٹھ کے دیکھنا ہی
بھلا وہ ایسے ہوئے تھے کس دن جو اب ہی تو وعدہ وفا کریں گے

یہ سچ ہی ناصح نہ ہوگا ملنا نہیں ہی اچھا نہ ہوگا اچھا
پھر آپ کو کیا، بُرا کریں گے تو اپنے حق میں بُرا کریں گے

نظام تقریر پھر عبث ہی جواب کچھ اس کا دے سکو گے
وہ اُس کا ہر بات پر یہ کہنا کہ ہم تو اپنا کہا کریں گے

(۳۶) مہر ۱۸۷۳ء

میرزا حاتم علی خلف میرزا فیض علی قزلباش۔ آپ اکبرآباد کے مشہور رؤسا سے تھے. فن سخن میں شیخ امام بخش ناسخ کے تلمیذ رشید تھے. رعایت لفظی کے دلدادہ تشبیہات اور استعارات کے مرد میدان میرزا غالب کے دوست تھے. غدر سے پہلے چنار میں منصف رہے بلکہ ۱۸۷۳ء میں زندہ تھے. ان کا دیوان چھپ چکا ہی. کلام کا انتخاب یہ ہی۔

(۱۰۸) غزل

گریباں ہاتھ میں ہی پاؤں میں صحرا کا داماں ہی
بس اب پاؤں ہیں اپنے اور سرِ خارِ مغیلاں ہی

کہاں یا رب روئے خمار کب یہ چشمِ فتّاں ہی
بیاضِ چشمِ آہو یاں کتابِ طاقِ نسیاں ہی

جلاتا ہی یہ پروانوں کو وصفِ شعلہ رویاں سے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمعِ سوزاں ہی

ہوئے شتِ وحشت ہم کو لے اُڑتی ہی بستی سے	ہمارے عنصرِ خاکی مگر ریگِ بیاباں ہی
جسے اہلِ ریا یعنی برجِ آبی کہتے ہیں شاید	وہ سایہ تیرے آنسو ڈھالنے کا چشمِ گریاں ہی
سبق کو دیکھتا ہوں نت پھر اور پھر الجھتا ہوں	مطولِ مختصرہ شرحِ شعرِ زلفِ پیچاں ہی

نہ کیوں ہر طرز میں حق حنا غزل شاہ کے آگے
مرا اُستادِ کامل تھا ناسخ سا سخنداں ہی

(۳۷) دبیر ۱۸۷۴ء

دبیر میرزا سلامت علی خلف میرزا غلام حسین ان کے آبا و اجداد کا وطن دہلی تھا مگر میر انیس ہی کی طرح ان کا بھی آفتابِ سخن لکھنؤ میں طلوع ہوا۔ شاعری میں میر مظفر حسین صاحب ضمیر کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے مدِ مقابل تھے اور اصل یہ ہی کہ دونوں آفتاب و ماہتاب تھے جس طرح میر انیس کی فصاحت مسلمہ ہی۔ اسی طرح آپ کی بلاغت ان کے مرثیے کئی جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو انتقال فرمایا۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۰۹) تلوار

جب مورچے پہ بجلیِ تیغِ دبیر گری	جنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
ہر صف میں خاک اُڑا کے اِدھر سے اُدھر گئی	پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
اُٹھنا اُن سے پوچھیے یہ جن کے سر پڑی

اٹھی گری بلند ہوئی پست ہو گئی
پی پی کے موذیوں کا لہو مست ہو گئی

(۱۱۰) رجز

ہمدل ہیں جب دلیر آئیں گے فوجِ شریر کے
ٹکڑے کریں گے خنجر و شمشیر و تیر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ برنا و پیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جنابِ امیر کے

اِک اک کی موت آج حسامِ دو سر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

(۱۱۱) علی اصغر کی فرقت میں ماں کی بیتابی

بانو پچھلے پہر اصغر کے لیئے روتی ہے
سر کو کبھی پیٹتی ہے جان کو کبھی کھوتی ہے
ایک وہ جاگتی ہے خلقِ خدا سوتی ہے
پر عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے

پیٹتے پیٹتے بے ہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہے ہے علی اصغر کی صدا آتی ہے

سوگ کا فرش ہے اور سامنے جلتا ہے چراغ
بازو میں داغِ حسن سینے میں اولاد کا داغ

جان اندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ
نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے نہ ہی زہرا کا نہ باغ

گوشہ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

ہائے اصغر! نہ ترا دودھ ہوا مجھ سے ادا
نہ تری سال گرہ کی، نہ ترا بیاہ کیا
نہ جھ کوئی مری گردن سے نہ اُترا تیرا
نہ لحد تجھ کو ملی اور نہ کفن تجھ کو ملا

ذبح تم ہو گئے سینے پہ لٹاؤں کس کو؟
چھوٹے چھوٹے یہ ٹکڑے میں چھپاؤں کس کو

(۱۱۲) شیریں سید الشہدا کی یاد میں

شیریں کو عجب لطفِ سلطانِ امم تھی
آنکھ اُس کی سوئے صورتِ بانوئے عجم تھی
ہر دم شہ والا کی وہ مشتاق قدم تھی
پتلی صفتِ قبلہ نما سوئے حرم تھی

غش کرتی تھی اقرارِ امامِ دوجہاں پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ سانوبر کے تڑکے اُسے آنا
گہ صبح سے مولا کے لئے فرش بچھانا
اور شام کو دروازے سے روتے ہوئے جانا
اور شام کے نزدیک بصد یاس اُٹھانا

شہ کے لیے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زمانا
جائز کیا فرزند پیمبر کا ستانا

مسلم کا مدینہ سے ہوا کوفہ کو آنا
آخر کو ہوئے شاہ بھی یثرب سے روانا

واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے
یاں روح نکلنے لگی شیریں کے بدن سے

تقدیر وہاں در بدر آقا کو پھراتی
گھبرا کے کبھی کوہ سے نیچے اتر آتی
شیریں یہاں در پر کبھی آتی کبھی جاتی
رہ گیروں کو جا جا کے سر راہ سناتی

دنیا میں ہیں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے
لوگو تمھیں کچھ دلبر زہرا کی خبر ہے

ہانی جو نہ اس نے خبر سبط پیمبر
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسر
ذی حجہ سے ہوئی تارک لذات وہ مضطر
سونے کے لیے فرش زمیں دونوں برابر

اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک سے لینا بھی غرض چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تھیں بنایا ہے یہ کیا حال
کہتی تھی یہ نیرنگ نظر آتا ہے امسال
پوشاک جو میلی ہے تو الجھے ہوئے ہیں بال
دریافت مجھی کو نہیں ہے تمام احوال

پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ ردا کی
اللہ بس اب خیر کرے آل عبا کی

(۳۸) انیس ۱۸۷۵ء

میر ببر علی خلف میر مستحسن خلیق۔ میر حسن مصنف مثنوی سحر البیان کے پوتے تھے

بزرگوں کا اصلی وطن دہلی تھا. مگر میر صاحب نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی ان کے مراثی نے اُردو زبان میں رزمیہ نظم کی کمی کو پورا کر دیا. اخلاقی جذبات و اعلیٰ خیالات نے اُن کی شاعری کا مرتبہ بلند کر دیا ہے. میرزا دبیر مرحوم ان کے ہمعصر تھے. دونوں باکمالوں نے اُردو نظم کی تاریخ میں ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ "معنی یابی اور الفاظ پرستی" کی جنگ کبھی ذرا بھی بیجا نہیں. ان کے زمانہ میں اُردو و ادب کے ترقی خواہوں میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے جو انیسیئے اور دبیریئے کہلاتے تھے. انیس کے ماننے والے بے ساختہ پن اور سوز و گداز کے شیدائی تھے. دبیر کے پیرو شوکت الفاظ. مبالغہ. صنائع و بدائع کو شاعری کا حسن سمجھتے تھے. شمس العلما مولانا شبلی نے ان کے انتقال سے کم و بیش تیس سال کی مدت کے بعد ہمارے زمانہ میں موازنہ انیس و دبیر لکھ کر اس بحث کو کہ اُردو شاعری کی اس خاص صنف میں ان دونوں شاعروں میں سے کس کا پایہ اونچا تھا تازہ کر دیا تھا اور انیس کے حق میں فیصلہ دے کر انھوں نے ان اعتراضات کی جو نساخ نے "ظوہار اغلاط" میں دبیر کے کلام پر کیے ہیں ایک حد تک تائید کی تھی لیکن مولوی نظیر حسن مہابی نے المیزان شایع کر کے ان دونوں باکمالوں کی بابت اسی منصفانہ رائے کا اظہار کیا ہے جو ہم نے قایم کی ہے. مراثی انیس کا مجموعہ چار جلدوں میں نولکشور پریس لکھنؤ نے عرصہ ہوا شایع کر دیا تھا لیکن حال میں نئی ترتیب اور تصحیح کے ساتھ مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی نے مراثی انیس کو پانچ جلدوں میں مرتب کیا ہے جس کی پہلی جلد میں میر صاحب کی آخری عمر کا کلام ہے اور دوسری جلد میں زمانہ شباب کا اور تیسری جلد میں متوسط عمر کا کلام ہے. جو نظامی پریس بدایوں سے شایع ہو چکی ہیں.

۲۵ شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء کو میر صاحب نے انتقال کیا ۸۰ برس کی عمر پائی نمونہ کلام یہ ہے

(۱۱۳) صبح

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

(۱۱۴) گرمی کی شدت

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو موجِ سیخ تک آئی کباب تھی

(۱۱۵) تلوار

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
ندی ادھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

پہونچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

(۱۱۶) مسافرت

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے

منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھیں تو اٹھاتا نہیں کوئی

(۱۱۷) سلام

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں
طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو

خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
چلے جو راہ تو چیونٹی کو ہم بچا کے چلے
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے
کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(۱۱۸) اولاد

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر

لذّت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
گل ہے یہ کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
آبادیِ کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہے وہ عصا پیر جواں ہوتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں ہوتا ہے جس سے
یہ ہے وہ نگیں نام و نشاں ہوتا ہے جس سے
وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں ہوتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ لال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرام جگر قوت دل راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی دل پہ گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لال ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے
وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ دُر ہے پُرِ جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہے اس کے

سلام (۱۱۹)

مرا راز دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت آل دنیا نے دیں بازیاں
میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہے سدّ باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

گئے پہنے نعلین آل مصطفےٰ
فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب ہو گئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسین
ترے صبر کے میں فدا یا حسین

فرس سے کسی نے اُتارا نہیں
چھُری کے تلے دم بھی مارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

(۳۹) قلقؔ ۱۸۸۰ء

خواجہ ارشد علی خاں بن خواجہ بہادر حسین فراقؔ لکھنوی۔ آپ خواجہ وزیرؔ لکھنوی کے خواہر زادہ تھے۔ اور شعر گوئی میں اُنھیں سے تلمذ حاصل تھا اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے مصاحبین میں تھے۔ جب ولی عہد کی شادی ہوئی تو اُنھیں خلعت دیا گیا مگر دربار شاہی سے خطاب عطا نہ ہوا۔ خلعت کو زیب تن کرتے ہوئے فوراً یہ شعر پڑھا ۔

خلعت و زرسے تو سب کچھ میں سنوارا جاؤں
ایسی شادی میں قلقؔ کہکے پکارا جاؤں

بادشاہ نے اُسی وقت اُن کو آفتاب الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اور دیگر متقربین سے زیادہ مرتبہ بلند کیا۔ ۱۸۸۰ء میں زندہ تھے۔ اس کے چند سال کے بعد ۱۸۸۰ء کے قریب انتقال ہوا۔ دیوان موجود ہے ایک مثنوی "طلسم الفت" چھوڑی۔ اس میں عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں جس کا ڈراما ہندوستان کی مشہور تھیٹریکل کمپنیاں اپنے

اپنے اسٹیج پر نہایت شوق سے کھیلتی ہیں۔ یورپ کے ڈراموں کا بہت اچھا حصہ وہ سمجھا جاتا ہی جس میں کوئی ایکٹر تنہائی میں اپنے دل میں آپ باتیں کرتے ہوئے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہی جس کی مثال شکسپیر کے مشہور پلے ہیملٹ سے ملتی ہی مثنوی طلسم الفت'' میں بھی اس قسم کا سین نہایت بے مثل طریقے سے لکھا گیا ہی چنانچہ ہم نے اپنے انتخاب مثنوی میں اسی سین کو لیا ہی جہاں عالم آرا حالت انتظار میں اپنے دل سے باتیں کر رہی ہی جو حسب ذیل ہے:۔

(۱۲۰) مثنوی

حسرت دید بڑھتی جاتی ہی
وحشت عشق سر اُٹھاتی ہی

متحمل جو ہو نہ سکتی تھی
آپ ہی آپ پھر وہ بکتی تھی

ہم کو جانی بہت نہ ترساؤ
اس قدر راستہ نہ دکھلاؤ

دل بہت بے قرار ہی ابتو
آنکھوں میں جان زار ہی ابتو

جو جو گزرے گی سب سہونگی میں
گو تلک منتظر رہونگی میں

مرض انتظار ای دلدار
ہی کل امراض سے بڑا آزار

گر مری زندگی میں آجاتے
صورت اپنی ذرا دکھا جاتے

حسرت دید تو نہ رہ جاتی
جو کہ کہنا تھا تم سے کہہ جاتی

ایک دن یہ کسی مصاحب نے
باتوں باتوں میں کہدیا اُس سے

یہ کئی دن سے ہے خبر مشہور	کسی شہزادہ کا جہاز حضور
اس طرف کو کہیں سے آیا تھا	یاں تک آنے بھی وہ نہ پایا تھا
کہ کچھ ایسی ہوا چلی ناساز	غرق اک دم میں ہوگیا وہ جہاز
سُنتے ہی یہ سخن وہ کشتہ غم	متوحش ہوئی کمال اُس دم
بولی گھبرا کے سچ کہو اے خوش خو	کہیں میرا ہی وہ نگار نہ ہو
نام کیا اُس قمر عذار کا تھا	رہنے والا وہ کس دیار کا تھا

(۱۲۱) غزل

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا	بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
وہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں	خدا بتوں سے نہ ڈالے معاملہ دل کا
خدا ہی خیر کرے رنگ آج بے ڈھب ہے	ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا
وہ رند ہوں کہ مجھے ہتکڑی سے بیعت ہے	ملا ہے گیسوئے جاناں سے سلسلہ دل کا
بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا	ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

خدا کے سامنے اپنا ہے اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

(۴۵) اسیر ۱۸۸۱ء

تدبیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں ولد سید مدد علی قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے

رہنے والے تھے۔ عربی میں جملہ علوم وفنون کی کتابیں علمارِ فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ شاعری میں شیخ غلام ھدانی مصحفی امروہوی سے تلمذ تھا۔ نصیرالدین حیدر شاہ کے عہد حکومت میں شاہی توسیل تھے۔ امجد علی شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ پھر واجد علی شاہ کی مصاحبت میں کئی برس گزرے اور کلکتہ میں ان کے ساتھ رہے۔ بعد ازاں ریاستِ رامپور میں چلے آئے۔ بڑے پُرگو کہنہ مشق قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی غزلیات میں اخلاقی مضامین زیادہ ہیں۔ چھ دیوان چھوڑے۔ آپ کا ایک فارسی کا دیوان بھی موجود ہی۔ علم عروض معانی و بیان سے کامل واقفیت تھی ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں بمقام رامپور انتقال کیا۔ کلام یہ ہی:-

(۱۲۲) غزل

آہ کب لب پر نہیں ہی داغ کب دل میں نہیں
کونسی شب ہی کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

بزم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل ہیں اُس کی ہی جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگانِ تر نے یہ اُڑائیں دھجیاں
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں

خونِ ناحق کا ہمارے داغ مٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دار چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حُسنِ لیلےٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلیٰ کو بھی آرام منزل میں نہیں

جس طرف جی چاہے گا میرا نکل جاؤں گا میں
سیکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

بندھ گئی زلفِ سیاہِ یار کی ایسی ہوا
لاکھ شمعیں جل رہی ہیں نور محفل میں نہیں

حد سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبنے جاتے ہیں کیونکر لوگ حیرت ہے مجھے
قدِ آدم آب بحرِ تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہے، ناخدا درکار کیا
طالبِ ملّاح کشتی دست سائل میں نہیں

ہوگیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خون خشک
ایک بھی دھبّا لہو کا تیغ قاتل میں نہیں

میرے زخموں کے لیئے تیار ہو مرہم اسیر
اس قدر نہ لگا رہ بھی شمشیر قاتل میں نہیں

(۴۱) منیر ۱۸۸۱ء

سید اسمٰعیل حسین خلف سید احمد حسین صاحب شاد بزرگوں کا اصلی وطن شکوہ آباد ضلع مین پوری تھا لیکن ان کا قیام عرصہ دراز تک لکھنؤ میں رہا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی بتقریب ملازمت کانپور و فرخ آباد میں بھی رہے۔ آخر زمانہ میں نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ رشک کے ارشد تلامذہ سے تھے ناسخ سے بھی استفادہ سخن حاصل کیا تھا منیر آغاز شباب سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں قدیم تخیل اور الفاظ پرستی کا رنگ نمایاں ہے لیکن نہایت پرگو اور مشاق شاعر تھے۔ پیدایش ۹ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء وفات ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں بمقام رامپور ہوئی۔ کلیات مطبوعہ ہے لیکن عام طور پر نہیں ملتی ان کی ایک مثنوی "معراج المضامین" کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ کلام یہ ہے:-

(۱۳۳) غزل

آمد تصور بت بیداد گر کی ہے
نزدیک صبح رخصت اہل نظر کی ہے
دنیا میں مثل کا غذ آتش زدہ ہیں لوگ

دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے
اب حسن یار چاندنی پچھلے پہر کی ہے
مہلت ہزار آنکھوں کو اک اک نظر کی ہے

پیری ہے صبحِ شامِ جوانی کے واسطے
چاروں طرف کو اُڑتے ہیں ہوش اہلِ عقل کے
آنکھیں بچھی ہیں چال کے رستہ میں دور تک
تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
آباد دل کی خانہ خرابی سے سب ہوئے
گو رسم و راہ خنجرِ ابرو نے قطع کی
یہ رنگ و بو کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
باقی ہے دل میں تیرِ مژہ کی ابھی کھٹک
اطفالِ اشک تنگ ہیں کھل کھیلیں کس طرح
دلی بگڑ کے بن گئیں کتنی ولایتیں
فرمانِ حسنِ گرم کے تابع ہیں نرم دل
نامِ سلوک سے ہیں اگر کان آشنا
کر بیٹھیں ترکِ عشقِ سراپائے یار ہم
رخصت طلب ہے عاشقوں سے حسنِ یار کا
آوارہ چھوڑ جاتی ہے جسم گلی کو روح
مانند اختلاط ہے سہل اب کی شاعری

مہمان شمعِ حسنِ بتاں رات بھر کی ہے
یارب ہوا دیارِ جنوں میں کدھر کی ہے
آمد قفس کی سمت یہ کس مشتِ پر کی ہے
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے
یارب نگاہِ مست یہ کس بے خبر کی ہے
بستی زمانے میں اسی ویران گھر کی ہے
پر تھوڑی سی لگاوٹ ابھی تک نظر کی ہے
اُتری ہوئی قبا کسی رشکِ قمر کی ہے
یہ پھانس یادگار کسی نیشتر کی ہے
اے آستین تجھ میں جگہ ہاتھ بھر کی ہے
جس گھر میں کچھ لوٹا اسی اُجڑے گھر کی ہے
پنبہ جہاں کہیں ہے رعیت شرر کی ہے
آواز خضرِ راہ ہر اک جانور کی ہے
مجبور ہیں کہ بیچ میں چاہت کمر کی ہے
پروانوں سے وداع چراغِ سحر کی ہے
مٹی خراب گرد و غبارِ سفر کی ہے
تیزی نہ طبع کی ہے نہ وقعت نظر کی ہے

کہنا یہ ہے کہ مرتے ہیں تم پر نثار ہیں
جو عاشقانہ شعر ہے سرکش ہے حسن سے
خالی ہے حسن بندش و مضمون سے یک قلم
مرغوب ہے محاورہ اربابِ شوق کا
موتی کے مول قطرۂ بے مایہ بکتے ہیں
پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہوگی اس طرف

تلخی نہ زہر کی ۔ نہ حلاوت شکر کی ہے
پُردرد جو غزل ہے وہ دشمن اثر کی ہے
ہر ایک بیت گٹھڑی مفلس کے گھر کی ہے
ہاں کس میں جنس کمال و ہنر کی ہے
مٹی خراب آج کل آبِ گہر کی ہے
اُمید آج تک وہی پہلی نظر کی ہے

بزمِ سخن میں لطفِ جنابِ عروج سے
شہرت منیر اس غزلِ مختصر کی ہے

(۱۲۴)

نہ شریکِ خونِ جگر سے خوش دلِ زار موجِ خطر سے خوش
کوئی میرے دیدۂ تر سے خوش ۔ میں کسی کی ترچھی نظر سے خوش
نہ نوید آہِ سحر سے خوش ۔ نہ فلک کی سیدھی نظر سے خوش
مرے کان تیری خبر سے خوش ۔ میری آنکھ حلقۂ در سے خوش
تری بو نہ لائی اِدھر کبھی ۔ مرے دل کی لی نہ خبر کبھی
صفتِ چراغ سحر کبھی ۔ نہ ہوا نسیم سحر سے خوش
زرِ سُرخ کی ہو طلب جہاں وہیں ای فلک ہو گہر فشاں
کوئی طفل طبع نہیں یہاں جو ہو سیرِ رقصِ شرر سے خوش

پھنسائے گیسوئے حور اُسے نہ ہنسائے صبحِ سرور اُسے
نہ خوش آئے آتشِ طور اُسے جو ہو میرے دردِ جگر سے خوش

تہہِ زلف ہوش ہوئے ہرن کھلے تیری آنکھوں کے مکر و فن
شب تاریں ہوئے راہزن۔ مرے قافلہ کے سفر سے خوش

بھرے جاؤں تیری وفا کا دم ہو اگرچہ سر بھی مرا قلم
نہ فراقِ جان و بدن کا غم نہ وصالِ گردن و سر سے خوش

کبھی تھے یہ کوچۂ یار میں کبھی دل کے جیب و کنار میں
مرے اشک فصلِ بہار میں نہیں دامنِ گلِ تر سے خوش

فقط آبرو ہی نہ مجھ کو دو۔ نگہِ غضب سے بھی کام لو
جسے آب تیغ کی پیاس ہو وہ ہو کیونکر آبِ گہر سے خوش

کروں دم میں قطع رہِ سفر نہ ہو غمِ عدم میں بھی بال بھر
اُسی تیغ سے مجھے ذبح کر جو رہی ہو قربِ کمر سے خوش

جسے حلمِ یار کا پاس ہے وہی رمزِ فقر شناس ہے
وہ دل آبلوں سے اداس ہے نہ حصولِ گنجِ گہر سے خوش

چھٹے دل سے سیرِ جہان کی۔ کہ وداعِ تن سے ہو جان کی
نہ ہو لو بھی آپ کے کان کی خبرِ چراغِ سحر سے خوش

مرے دل ہیں۔ داغِ وفا ہی جو۔ اُسے لاکھ طرح کا رتبہ دو

یہ کفِ کلیم سے شاد ہو نہ رہے جبینِ قمر سے خوش

سوئے زلف ہی نہ گزر کرے رگِ جاں میں بھی کبھی گھر کرے

وہی اہل توجہ ادھر کرے جو ہو وصلِ موئے کمر سے خوش

یہ نہیں شبہ دل میں نہ ڈھالیئے گرے محو ہونے کو مانیئے

اگر آنکھ جھپکے تو جانیئے کہ نہیں ہیں برقِ نظر سے خوش

نہیں معصیت کی کچھ انتہا۔ کوئی کارِ نیک تو ہو بھلا

کروں اہلِ شہر کو ای خدا میں ہوائے دامنِ تر سے خوش

تپِ سوزِ غم کے مریض کو مئے ناب سے نہ سرور ہو

جلے اپنی آگ میں آپ جو وہ ہو کیوں کر آتشِ تر سے خوش

مرے دل کی دیکھ کے بے بسی ہو شریکِ عالمِ بے بسی

لبِ گورِ زنگ آسے وہ ہنسی جو ہو دل کے زخمِ جگر سے خوش

کروں عیادت نزع کی جو دکھائیں شکل وہ چاند سی

رہیں آنکھیں ختم اب فنا میں بھی دمِ آخری کی نظر سے خوش

یہی زلف میں ہے اسیر بھی یہی تیرے در کا فقیر بھی دلِ بے قرارِ منیر بھی، ہو کبھی کرم کی نظر سے خوش

(۴۲) رخشاں ۱۸۸۳ء

نواب ضیاء الدین خاں خلف فخر الدولہ احمد بخش خان بہادر دہلوی فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص تھا۔ مرزا غالب سے قرابت کے علاوہ تلمذ کی نسبت بھی تھی۔ دہلی کے اہل کمال میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ شعر کے نقاد بھی۔ عامیانہ خیالات اور ٹکسال باہر محاورات کو اپنے کلام سے دور رکھتے تھے۔ علم تاریخ کے ماہر تھے اور گزشتہ واقعات سے جو نتائج مرتب کرتے تھے وہ نہایت گراں مایہ اور قابل قدر ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے سنہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۲۵) غزل

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب آئے جو اپنے وعدے پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا — مردہ صدہا ہزار سال ہمیں
دل میں مضمر ہے معنی باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع اپنا ہے نیّرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وصال ہمیں

(۳۴) قدر ۱۸۳۳ء

مولوی غلام حسین بلگرامی ولد سید خلف علی۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید بن امام زین العابدین سے ملتا ہے بلگرام کے باشندے تھے ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ تشریف لائے اور وہاں علوم عربیہ حاصل کیے شاعری میں پہلے آپ سحر و برق سے اصلاح لیتے رہے ان دونوں کی وفات کے بعد شیخ امداد علی بحر ارشد تلامذہ حضرت ناسخ کے شاگرد ہوئے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت قدر لکھنؤ سے دہلی چلے آئے اور مرزا غالب مرحوم سے استفادہ اٹھایا آخر میں سرکار آصفیہ میں ملازم ہو گئے تھے صنائع بدائع و عروض سے بخوبی واقف تھے پنگل یعنی ہندی کا عروض جانتے تھے۔ قواعد العروض اور اعجاز خسروی کا حاشیہ آپ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ کلیات شایع ہو چکی ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

(۱۱۶) غزل

خدا کو مانو ہنسی نہ جانو نہ میرے دل پر جفا کرو تم
ہلے گا عرش بریں کا پایہ ذرا تو خوف خدا کرو تم

زمانہ الٹا ہے کیا کرو تم برا جو ہے وہ ادا کرو تم
وفا کریں ہم جفا کرو تم دعا کریں ہم دغا کرو تم

سرورِ وصلت کہ رنجِ فرقت دوائے الفت کہ دردِ کلفت
نشانِ بوسہ کہ داغِ حسرت قبول ہے جو عطا کرو تم

ہمیں نے پہلے گلا کٹایا ہمیں نے قاتل تمھیں بنایا
ہمیں نے یہ ننگ سب جایا ہمارے حق میں دعا کرو تم

ابھی کفن مُردے پھاڑ ڈالیں ابھی مزاروں سے سر نکالیں
ابھی جو محشر کی چال کے چالیں ذرا قیامت بپا کرو تم

دل و جگر ٹکڑوں پہ نچھاور تو جان قربان ہے لبوں پر
اب ایک سر ہے اُسے بھی لیکر قدم پر اپنے فدا کرو تم

نباہ ہوگا اسی میں باہم رہے یہ دونوں طرف کا عالم
کریں تکلف نہ تم سے کچھ ہم نہ ہم سے شرم و حیا کرو تم

ہزار دل ہوں جو اک جفا جو۔ دریغ تم سے نہیں سرِ مو
اسیرِ گیسو قتیلِ ابرو شہیدِ ناز و ادا کرو تم

لگا ہے دل ہم سے خیر بہتر رہیں جو اغیار بھی مکدر
ذرا نہیں اختیار جس پر پھر اس کے بارے میں کیا کرو تم

ہماری شہ رگ پھڑک رہی ہے کہ روح اس حل ٹاٹ رہی ہے
تمام گردن لٹک رہی ہے ابھی نہ خنجر جدا کرو تم

ہوئیں جگت آشنا نگاہیں۔ بیں کفر و اسلام سب سے راہیں
تو تم اس سے وہ جس کو چاہیں۔ نئے نئے آشنا کرو تم

ہمارے نالوں کو سُن کے جو پاؤ یقیں ہی غش کھا کے لوٹ جاؤ
نہ لوٹ جاؤ نہ غش میں آؤ تو دفعتہً واہ واہ کرو تم

بہت نہ بھٹکے ہوئے رہو تم پھنسے ہو اب جو پڑے سہو تم
جو بوسے لیں لوں تو کیا کہو تم گلے لگا لوں تو کیا کرو تم

بجا ہے جام اگلا تھا۔ تمہارا اس میں گناہ کیا تھا
یہ میری تقدیر میں لکھا تھا نہ مجھ پہ جور و جفا کرو تم

بتاؤ اتنی قدر کیا کہا تھا یہ ہی نتیجہ ہے عاشقی کا
غریب بیکس ذلیل و رسوا خراب و خستہ بھرا کرو تم

(۴۴) نواب ۱۸۸۱ء

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والی رامپور۔ نواب یوسف علی خاں کے صاحبزادے تھے شاعری میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد تھے معقول و منقول کی کتابیں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سے پڑھی تھیں۔ آپ کے عہد میں رامپور مشرقی علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر فن کے کامل موجود رہتے تھے۔ اردو و فارسی دیوان چھوڑے بنہایت علم دوست اور شریف نواز تھے۔ تاریخ ولادت ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء

وفات ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۸۵ء نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۲۷)

ملے کیونکر نہ تیری رہ گزر کی سرزمیں برسوں
کہ نالوں سے مرے کانپا کیا عرشِ بریں برسوں

بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کُنجِ مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں برسوں

تری صورت کا نقشہ جب کبھی کھچ جائے گا پورا
تو صنعت پر کرے گا ناز صورت آفریں برسوں

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دمِ آخر
رہے گی یاد اس کو بھی نگاہِ واپسیں برسوں

اُڑائیں دھجیاں ہاتوں نے اس کی جوشِ وحشت سے
رہی بہتی دیدۂ خونبار پر جو آستیں برسوں

کیا عشقِ کمر نے بے نشاں ایسا نہ پائیں گے
عدم میں بھی اگر ڈھونڈیں گے مجھ کو ہم نشیں برسوں

رفاقت لذتِ زخمِ جگر تیری میں جب جانوں
کہ مرقد میں بھی میرے منہ سے نکلے آفریں برسوں

ہوئے ہوں گے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہی ہم سے تو اُس بے رحم کافر کی نہیں برسوں

نصیبوں میں جو لکھی ہی بُرائی وہ نہ جائے گی
اگر رگڑوں گا در پر کعبہ کے نقشِ جبیں برسوں

اسیرِ دامِ گیسو دل ہوا تو یوں بھی وحشت ہی
نہ چھوڑوں گا کبھی ہاتھوں سے زلفِ عنبریں برسوں

اسی اُمید پر شاید کسی دن آؤ تم باہر
نہ جائیں گے تمھارے در سے دم بھر کو کہیں برسوں

جفا سے اُس کی بھڑے گا نہ ای نواب کوئی بھی
رہیں گے دیکھ لینا کوئے جاناں میں ہمیں برسوں

(۴۵) حیاؔ ۱۸۸۷ء

شاہزادہ میرزا رحیم الدین خلف میرزا کریم الدین رساؔ نبیرہ شاہ عالم ثانی سنہ ۱۲۲۱ھ میں پیدا ہوئے شاعری میں حضرت شاہ نصیرؔ و ذوقؔ سے تلمذ تھا۔ ذہین طبّاع اور نازک خیال شاعر تھے شطرنج کھیلنے میں مشہور تھے۔ ولایت سے جتنے شطرنج کے نقشے آتے تھے۔ اُن کو حل کرنا آپ کا کام تھا۔ داغؔ و امیرؔ کے ہمعصر تھے۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والیِ رام پور کے مصاحبوں میں داخل تھے بسنہ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں دُنیا سے رخصت

ہو گئے ۴۰ سال کی عمر پائی۔ ان کا دیوان صاحبزادہ محمود علی خاں رام پوری نے چھپوایا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

(۱۲۸) غزل

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے
رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہدفِ تیر لوحِ تربت ہے
بعد مردن بھی یہ عادت ہے

ہو چکا وصل وقتِ رخصت ہے
اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمھاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش
ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ
آج اُس کی کچھ اور حالت ہے

(۴۶) اختر ۱۸۸۷ء

واجد علی شاہ (والیِ اودھ) آپ امجد علی شاہ کے خلف اکبر تھے ۱۸۴۷ء میں مسند نشین

ہوئے آپ کی طبیعت نہایت عیش پسند واقع ہوئی تھی. فیاض بھی تھے ۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت کا انتظام گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آپ کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیجی. بارہ ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس حالت میں بھی عیش و نشاط سے ہاتھ نہ اُٹھایا. گزشتہ فیاضی میں فرق نہ آنے دیا۔ ۱۳ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں وفات پائی. علماء و شعراء کے قدردان تھے. شاعری میں جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ چھ دیوانوں کے علاوہ آپ کی مثنویاں قابل دید ہیں جن میں اپنے کارناموں کو آزادانہ طریقے سے کھلے ہوئے الفاظ میں قلمبند کیا ہے. فن موسیقی کے دلدادہ تھے. نمونہ کلام یہ ہے۔

(۱۲۹) غزل

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا — وحشتِ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا
رُخ ترا آتشِ سوزاں نہ ہوا تھا سو ہوا — دل مرا شمعِ شبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا
ابر مجھ پہ کبھی گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا — گھر کبھی خانۂ زنداں نہ ہوا تھا سو ہوا
چمنِ عشق بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا — زخمِ دل خوردہ نمکداں نہ ہوا تھا سو ہوا
زرد رنگِ رُخِ جاناں نہ ہوا تھا سو ہوا — دل کبھی طفلِ دبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا
یا خدا دیر میں ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا — کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا سو ہوا
جور جو گنبدِ گرداں نہ ہوا تھا سو ہوا — دل کبھی گنجِ شہیداں نہ ہوا تھا سو ہوا
رُخِ انور سے میں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا — کبھی اے زلف پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ظلم و جور ای شبِ ہجران ہو تھا سو ہوا | خانہ گور ہیں مہماں نہ ہوا تھا سو ہوا

چشمِ انصاف ہے طوفان ہوا تھا سو ہوا
دلِ آختر چمنستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

(۴۷) ادیب ۱۸۹۱ء

مولوی سیف الحق ولد مولوی احسان الحق دہلوی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ان کے مورثِ اعلیٰ تھے عربی فارسی اور تھوڑی سی انگریزی جانتے تھے. فن سخن میں حضرت غالب کے شاگرد تھے. شاعری کے علاوہ زبردست انشاء پرداز تھے ۱۸۸۲ء میں مور گزٹ دہلی کے ایڈیٹر ہوئے. اس کے بعد لاہور پہونچکر ۱۸۸۳ء میں رفیق ہند کے جواب میں شفیق ہند جاری کیا شفیق ہند اُس زمانہ میں جمہور مسلمین اور اُن کے مسلمہ لیڈروں کی پالیسی سے الگ ہوکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے تھا. اس کے ظرافت آمیز مضامین نے اُس کی ہوا اکھیڑ دی آخر زمانہ میں ریاست حیدر آباد سے تعلق ملازمت ہوگیا تھا وہیں بعمر ۴۵ سال ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں انتقال ہوگیا کلام کے جمع کرنے پر توجہ نہ تھی. اس لئے کوئی دیوان موجود نہیں ہے کلام کا انتخاب یہ ہے:-

(۱۳۰) غزل

دولتِ اشک نظر آتا ہے قلزم مجھ کو
جستجو خاک کی ہے بہرِ تیمم مجھ کو

خود پسندی نے مجھے اور تمھیں ایک کیا
کیوں مری طرح سے آتے ہو نظر تم مجھ کو

بحرِ مواج میں قطرہ کا تماشا دیکھو
ناخدا چھوڑ چلا ہے سرِ قلزم مجھ کو

خوگرِ جور ہوں الطاف و محبت معلوم
میں نہیں غیر کہ ہو لطفِ ترحم مجھ کو

دل ہیں خاموشی کو اک خصرِ تعلق جانا
نہ بن آئی کوئی جب طرزِ تکلم مجھ کو

دل ہیں دہشت نہیں تنگِ عدوی ابتو
آپ کا لطف گوارا نہ ترحم مجھ کو

کام بگڑے نظر آتے ہیں جب ہی تک کہ خدا
گوشِ دل دے کے سنے یارئے تکلم مجھ کو

موجِ دریا کی حقیقت بھی کھلی بارے ادیب
جوشِ گریہ نے دکھایا جو تلاطم مجھ کو

(۴۸) صفدر ۱۸۹۳ء

صاحبزادہ محمد صفدر علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں والیِ ریاست رامپور کے صاحبزادے میں خوش گو، عالی فکر شاعر تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے طبیعت میں شوخی مضامین میں گرمی ہے۔ آپ کا دیوان مطبوعہ موجود ہے جو شاعری کی دنیا میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زمانہ قتل جنرل اعظم الدین خاں ۱۸۹۱ء میں وارد کلکتہ تھے

اس کے دو سال کے بعد ہی انتقال ہوا۔ تاریخ انتقال ۲۰ جمادی الآخر ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء ہے۔ ۱۰ جنوری کو رام پور میں دفن ہوئے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

(۱۳۱) غزل

تھا شکایت کا جو اُن سے حوصلہ جاتا رہا — سامنا جب ہو گیا سارا گلہ جاتا رہا
فصلِ گل میں بیڑیاں کاٹیں عبث حدّاد نے — تھا جو سرکارِ جنوں سے سلسلہ جاتا رہا
ہائے قسمت بے خودی میں کھو گئی تصویرِ یار — دل کے بہلانے کا یہ بھی مشغلہ جاتا رہا
اس قدر صدمے سہے ہم نے بتوں کے عشق میں — دل لگانے کا کسی سے حوصلہ جاتا رہا
جام ٹوٹے اتنے دورِ چرخِ مینا رنگ سے — محتسب کا شکوہ قاضی کا گلہ جاتا رہا
تھیں وہ ساری خستیں جوشِ جنوں تک اب کہاں — سر سے وہ سودا دلوں سے ولولہ جاتا رہا
دوستوں کے ہاتھ سے صدمے اُٹھائے اس قدر — دل سے اپنے دشمنوں کا بھی گلہ جاتا رہا

عہدِ پیری میں کہاں صفدر جوانی کے سے رنگ
وہ بہار آخر ہوئی وہ ولولہ جاتا رہا

(۴۹) عزیز ۱۸۹۳ء

نواب حافظ عبد العزیز خاں بریلوی خلف نواب سعادت یار خاں۔ آپ حافظ الملک

حافظ رحمت خاں کے پوتوں میں تھے عربی. فارسی میں مشرقی علوم کی تکمیل کی تھی سنسکرت بھی جانتے تھے۔ضلع بریلی کی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب مجالس العلوم کے نام سے شہرت پذیر ہی جس میں تمام علوم وفنون کا بیان ہی۔ دیوان فارسی و اردو ۱۸۹۲ء میں چھپ چکا ہی۔ ۵۰ برس ۵ ماہ کی عمر پاکر ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہی:۔

(۱۳۲) غزل

یا خدا دل میں غمِ یار کی مہمانی ہی
شرم رکھ لے کہ بہت بے سروسامانی ہی

عشق کا بھید چھپانے کو بنا ہوں مجنوں
پردۂ رازِ محبت مری عریانی ہی

اشکِ گلنار کی ہی عشق کے بازار میں قدر
قیمتی ہی وہی یاقوت جو رمانی ہی

راستے اور بھی ہیں ملکِ عدم کے لیکن
تیغ کے گھاٹ اُتر جانے میں آسانی ہی

نقدِ جاں ہی دلِ مجروح میں کیونکر محفوظ
زخم کے چور سے دشوار نگہبانی ہی

عشق سینے میں بنا سو تو آنکھوں میں سرشک
طرفہ شی ہی کہ کہیں آگ کہیں پانی ہی

لائے ہو ہر ہی طبعِ ازل سے ہمراہ
چین ماتھے کی تمہارا خطِ پیشانی ہی

صدمہ پہونچا تپشِ دل سے تنِ نازک کو
وصل کی شب مجھے یہ اُن سے پشیمانی ہی

خرمنِ غنچہ رگِ گل سینۂ بلبل ہی عزیز
کثرتِ زخم ہی چھالوں کی فراوانی ہی

(۵۰) فروغ سنہ ۱۸۹۳ء

شاہزادہ میرزا قیصر بخت دہلوی خلف میرزا آغا دربخش صابر۔ میرزا جہاں بخت کے زمانہ سے دہلی کو چھوڑ دیا تھا اور بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہمیشہ مومنؔ و غالبؔ و ذوقؔ کے مشاعروں میں شریک رہے تھے۔ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ مگر امام بخش صہبائی اور عبدالرحمٰن خاں صاحب احسانؔ کو بھی اپنا کلام دکھاتے رہتے تھے۔ نہایت پر مضمون اور معنی خیز اشعار کہتے تھے صاحبِ دیوان تھے سنہ ۱۳۱۱ھ مطابق سنہ ۱۸۹۳ء کے قریب انتقال ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

غزل (۱۳۴)

بڑھ گئی بعد مرے گرمیِ وحشت میری
مثلِ سیماب گردوں اُڑتی ہے تربت میری

آپ کا عشق بھی کیا قفلِ زباں بندی ہے
نہیں کھلتی جو زباں بہرِ شکایت میری

عکسِ آئینۂ دل میں ہے ترے قامت کا
میرے پہلو میں ہے موجود قیامت میری

عرشِ اعظم پہ زمیں کا سرِ عزت پہونچا
اس قدر بڑھ گئی عالم میں کدورت میری

مجھ کو جز جامۂ وحشت کوئی جامہ نہ ملا
چشمِ آہو کی سیاہی ہوئی قسمت میری

ہے فروغ اپنا کلام آئنۂ غیب نما
کہ نظر آتی ہے اشعار میں فکرت میری

(۵۱) مذاق ۱۸۹۴ء

مولوی دلدار علی شاہ بدایونی والد کا نام شیخ نثار علی صدیقی ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ خاقانی ہند ذوق دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ زانوئے شاگردی تہہ کرتے وقت فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر اُستاد کو سنایا تھا:۔

کیا کروں عرض اشتیاق اپنا ذوق تھا یہ ترے تلمذ کا	شعر کہنا غرض تھا شاق اپنا کہ تخلص کیا مذاق اپنا

۱۱ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء کو بدایوں میں انتقال ہوا۔ انتقال سے ۳۰ سال قبل عاشقانہ شعر کہنا چھوڑ دیا تھا صرف نعت و منقبت لکھا کرتے تھے اور ذکر و شغل میں مشائخانہ زندگی بسر کرتے تھے کبھی اپنا دیوان مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ زمانہ شباب کے عاشقانہ کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ انتقال کے بعد بعض شاگردوں نے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں ہر قسم کا کلام جو دستیاب ہو سکا داخل ہے۔ کتاب کلام دلدار علی مذاق کے نام سے بدایوں میں طبع ہوئی ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:۔

(۱۳۴) غزل

جو گرم ہے حُسن اُس حسیں کا۔ نہ وہ پری کا نہ حورِ عیں کا
نقاب اُٹھے رُوئے آتشیں کا تو چاند جل جائے چودھویں کا

قلم کو زہرہ نہیں رقم کا۔ ہی دل میں دفتر بھرا الم کا
ورق ہی جو اس کتابِ غم کا۔ وہ ایک دیوان ہی حزیں کا

تلاش دیر و حرم ہی بے جا۔ کہ جا بجا ہی وہ جلوہ فرما
جہاں پہ ڈھونڈا وہیں پہ پایا۔ ہر ایک مکاں ہی اُسی مکیں کا

ہوا جو طفلِ سرشک پیدا۔ بنا وہ جلوے میں شکِ موسےٰ
کیا تھا کچھ ہم نے وقت گریہ۔ خیال اُس چشمِ سُرمگیں کا

مذاق کہدے یہ نکتہ داں سے۔ بڑھا دیا ہم نے لامکاں تک
کیا تھا ناسخ نے آسماں سے۔ بلند رتبہ گراس زمیں کا

(۵۲) فطرت ۱۸۹۴ء

سید حامد علی گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ ایشیائی شاعری میں مغربی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ مختلف عنوانوں پر نظمیں لکھتے تھے۔ ۴ سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء کے قریب انتقال ہو گیا۔ نمونہ کلام یہ ہی:۔

(۱۳۵) جلوۂ بیگانہ

جلوہ تیرا راہِ فنا میں — شوخی تیری چشمِ بقا میں
قوت تیری دستِ دعا میں — ٹھنڈک تیری بادِ صبا میں

نکہت تیری برگِ حنا میں
عصمت تیری چشمِ حیا میں

ای تو اور کرشمہ تیرا
پردۂ وحدت پردہ تیرا
ہر اک دل میں جلوہ تیرا
بزمِ تصوّر کمرہ تیرا

صورت پیاری نامِ خدا ہی
رنگ نرالا ڈھنگ نیا ہی

تو ہی ساقیِ بادۂ عرفاں
غمزے تیرے فتنۂ دوراں
بستی تیری شہرِ خموشاں
پرتو تیرے سائے خوباں

چشمِ ہوسے خلوت تیری
سب سے اوجھل صورت تیری

بزم میں تیری ہو کا عالم
شاخِ تکلّم دستِ ماتم
محفل تیری چشمِ پُر نم
عاشق تیرے نالاں پُر غم

لطفِ محبّت جس نے پایا
جی مر کر کچھ لطف اُٹھایا

مستی تیری چشمِ ادا میں
آہٹ تیری بانگِ درا میں
ہستی تیری رنگِ فنا میں
قائم تجھ سے جان حیا میں

	ہر اک رنگ میں تو ہی تو ہی باغِ جہاں میں تیری بو ہی	
پُر رونق ہی بزم وحدت تجھے تیرے رمزِ حقیقت	ہی آباد تجھی سے جنت کس کی روح میں اتنی قدرت	
	یہ منہ ایسی باتیں فطرت کچھ تو سوچو اپنی حقیقت	

(۵۴) بیان سنہ ۱۹۰۰ء

سید مرتضیٰ میرٹھ کے سادات عظام سے تھے۔ نازک مزاج ایسے تھے کہ چاند سورج کی روشنی برداشت نہ کر سکتے ۱۴ برس کی عمر سے آخر وقت تک گوشۂ تنہائی میں گزار دی۔ زبان دہلی کے مقلد مگر اجتہاد کا پہلو لئے ہوئے تھے اپنے ہمعصروں میں سے کسی کو کم خیال میں لاتے اور تھے بڑے مضمون آفریں۔ قدرت نے جدت طرازی کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی تصنیفات میں چھوٹا سا مجموعۂ نعتیہ۔ اور کچھ کلام عاشقانہ "ذالیشیائی شاعری کی الوداع" ان کا ایک مسدس مشہور ہی ساٹھ سال کی عمر پاکر سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق سنہ ۱۹۰۰ء میں دار فانی سے سدھار گئے۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہی:-

(۱۳۶)

اُمید سے خطاب

کلیسا میں بُت کی ادا بن گئی تو
حرم میں پہونچکر خدا بن گئی تو

یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی
کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو

لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے
اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے
ہر اک درد و دکھ کی دوا بن گئی تو

بیاباں کے سوا تو نے سب سے نبھائی
یہیں آ کے بس بے وفا بن گئی تو

انتخاب از "ایشیائی شاعری کی لو داغ"

(۱۳۷) رخصت عروس

سلاطیں کا تابع نہ ہا ہے زمانہ
جدھر جس طرف ان کا توسن روانہ

اُسے طابق النعل بالنعل جانا
نئی چال چلتا رہا ہے پرانا

اگر کاخ دولت کی نوبت نئی ہو
تو نوبت کا ڈنکا نیا گت نئی ہو

شبہانِ سلف کی تگاپو کہاں ہے — وہ دلی کہاں ہے وہ اردو کہاں ہے
جہاں کو قرار ایک پہلو کہاں ہے — خدا کی مشیت پہ قابو کہاں ہے

مٹے کاغذی ناؤ کے کھینے والے
گئے مفت کی روٹیاں دینے والے

ہوگے ذل میں گرفتار کب تک — گھسیٹو گے تسبیح و زنار کب تک
نہ عقبیٰ سے ہوگا سروکار کب تک — رہے گی یہ دنیائے غدار کب تک

جھکو جانب کعبہ چھوڑو بتوں کو
نہ پتھر پسیجیں گے توڑو بتوں کو

مسافر ہے انسان بحرِ فنا کا — سفر چاہیئے دیکھ کر رخ ہوا کا
خطر ہے سفینوں کو موجِ بلا کا — کہا مان لو نظم کے ناخدا کا

نہ کشتی سے گرداب میں گر پڑو تم
معلم جدھر پھیر دے پھر پڑو تم

(۵۴) امیر سنہ ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائی۔ ولادت ۱۶ شعبان سنہ ۱۲۴۳ھ بہ عہد شاہ نصیر الدین حیدر بمقام لکھنؤ۔ وفات ۱۹ رجادی الاخری سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء بمقام

حیدرآباد دکن۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے قابلِ فخر شاگرد ہیں اور بعد وفات استاد کے شعرائے لکھنؤ میں بجائے خود استاد اور یادگار سلف مانے جاتے تھے۔ اُن کی اور جلال کی وفات نے لکھنؤ کے معمر کہن مشق شعرا کا خاتمہ کر دیا۔ امیر مینائی کی معلومات بڑی حد تک کافی ووافی تھی۔ زبانِ اُردو کی بدقسمتی تھی کہ امیر اللغات کا پورا مواد جمع تھا مگر صرف الف ممدودہ و مقصورہ کی دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ آپنے وفات پائی اور اب امیر کا ہمسر اور اس پایہ کا محقق کوئی نظر نہیں آتا اُن کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک دیوان نعتیہ اور دو دیوان عاشقانہ ایک مثنوی صبح ازل اور ایک شام ابد۔ تذکرہ انتخاب یادگار اور متعدد مسدس وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

غزل (۱۳۸)

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
پھوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

مُسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

دل میں باتیں بھری تھیں کیا کیا کچھ
ہائے کچھ وقتِ واپسیں نہ کہیں

نہ تڑپ اس قدر دلِ بیتاب
سہم جائے وہ نازنیں نہ کہیں

آگ ہو جائے گا وہ شوخ امیر
کھینچنا آہِ آتشیں نہ کہیں

(۱۳۹)

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سر مزار ہوں میں

پھر اُس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

پڑا ہے دستِ اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر
نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بے قرار ہوں میں

کچھ آج میں نے نئی پی ہے حضرتِ واعظ
ازل کا مست ہوں انا شراب خوار ہوں میں

نگاہِ قہر سے مجھ کو نہ دیکھا ای دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں

وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جس طرف گزرے
زمیں پکار اٹھے قابلِ مزار ہوں میں

وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیرؔ
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

(۵۵) احمدی سنہ ۱۹۰۰ء

نواب غلام احمد صاحب احمدی مرحوم یکم جنوری ۱۸۳۰ء کو بمقام کنج پورہ ضلع کرنال پیدا ہوئے۔ خاندان کنج پورہ جس کے نواب صاحب مرحوم ایک ممتاز رکن تھے پنجاب کے مشہور تاریخی خاندانوں میں سے ایک ہے اس خاندان کے مورث اعلیٰ نواب نجابت خاں صاحب تھے جو ۱۷۳۰ء کے قریب افغانستان سے آئے تھے۔ اور جنھوں نے ضلع کرنال و انبالہ میں ایک علاقہ پر حکومت حاصل کر کے کنج پورہ کو آباد کیا تھا جو اس وقت تک ریاست کنج پورہ کا صدر مقام ہے۔ نواب

غلام احمد خاں صاحب مرحوم ابتداء عمر سے علمی مذاق رکھتے تھے، بچپن ہی سے ان کو شعر و شاعری اور تصنیف کا شوق تھا چنانچہ دس برس کی عمر میں اُنھوں نے ایک قصہ بنام "قصہ کرشن" نظم میں لکھا تھا۔ عربی اور فارسی کی تکمیل کے بعد ایک مدت تک نواب صاحب نے ملک میں سیر و سیاحت کی اور اُس کے بعد ایک عرصہ تک ریاست ٹونک میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے ۱۸۶۰ء میں ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے اور مہاراجہ جیاجی راؤ نے ضلع عیسےٰ گڑھ کا انتظام ان کے سپرد کیا جس کا ذکر آج تک وہاں کی رعایا کے زبان زد ہے ۱۸۸۶ء میں مہاراجہ جیاجی راؤ کی وفات پر گوالیار میں جب کونسل آف ریجنسی قایم ہوئی اس وقت ریاست کے تمام مسلمان عہدہ داروں میں سے گورنمنٹ نے صرف نواب صاحب کے سپرد اول صیغہ جوڈیشل اور بعد کو صیغہ تعلیم کیا جس کے متعلق ان کی خدمات آج تک ریاست میں مشہور ہیں اور جس کے اعتراف میں ۱۸۹۵ء میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے "نواب" کا خطاب مرحمت ہوا ۱۸۹۶ء میں کونسل کی مدت ختم ہونے پر نواب صاحب فرایض منصبی سے سبکدوش ہوگئے اور آخر وقت تک خیر کے کاموں میں مصروف رہے ۱۶ اپریل ۱۹۰۰ء مطابق ۱۳۱۸ھ کو ۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ باوجود جلیل القدر عہدوں کی ذمہ داریوں میں مصروف رہنے کے کبھی اپنے علمی مشاغل سے دست بردار نہ ہوئے خط و خال کی شاعری جوانی میں ہی ترک کردی تھی۔ توحید اور اخلاق اور سوشل مضامین پر نثر اور نظم میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ جن میں "مثنوی ہفت رانہ" "اثبات حق" اور

صبح نور" کو خاص شہرت حاصل ہے۔

(۱۴۰)

نشاں کیا کیا دکھائے تو نے یا رب بے نشاں ہو کر
عیاں کیا کچھ کیا ہے تو نے اے خالق نہاں ہو کر
تمنا ہے ترے دریوزہ گر کی تجھ کو پہچانے
ترے در تک پہنچ جائے غبارِ جسم و جاں ہو کر
گلستاں میں گلوں کے کان ہیں آواز پر تیری
ترا ذکرِ خفی کرتا ہے ہر پتا زباں ہو کر
ترا جوشِ کرم رفعت اگر دے اہلِ پستی کو
مہ و خورشید زمیں سایہ فگن ہو آسماں ہو کر
تمنا ہے سراپا محوِ ذکرِ ذاتِ باری ہوں
مرا ہر موئے تن سرگرمِ مدحت ہو زباں ہو کر
تماشوں میں تری قدرت کے آنکھیں محوِ حیرت ہیں
نرالا رنگ ہے پیشِ نظر گزرا جہاں ہو کر
جنہیں طفلی میں صرف بازیٔ چوگان و گو پایا
وہی محوِ خود آرائی نظر آئے جواں ہو کر

تنِ عریاں کو بلبوسِ عنایت کی تمنّا ہی
لباسِ جسم پھٹ جائے گا اک دن دھجیاں ہو کر
کہاں کا ضبط کیسا ننگ، جوشِ یادِ باری میں
دلِ بے تاب پہلو سے نکل بھاگا فغاں ہو کر
زباں کو میری گویا کر الٰہی اپنی مدحت میں
کروں مُردہ دلوں کو زندہ دل معجز بیاں ہو کر
ترے آثارِ قدرت پر کروں دلچسپ تقریریں
جھکاؤں گر دنیں پیرانِ پیکر کی جواں ہو کر
کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھ کو ہمت دے
سہارے پر ترے اُٹھتا ہوں تیرا مدح خواں ہو کر
جہاں بھولوں بتا جس جا بہک جاؤں ہدایت کر
جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہی
فلک کے بوجھ اُٹھانے پر تلا ہوں ناتواں ہو کر

ترے در پر جبینِ احمدی سرگرمِ سجدہ ہی
تمنا ہی یہیں رہ جائے خاکِ آستاں ہو کر

(۵۶) مجروح سنہ ۱۹۰۲ء

میر مہدی حسین خلف میر حسین نگار دہلوی۔ میرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حالی۔ داغ۔ انور۔ ظہیر کے ہمعصر تھے چنانچہ مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنوگے کبھی بلبل کا ترانہ ہرگز

اردوئے معلٰی میں ان کے نام میرزا صاحب نے بہت سے خطوط لکھے ہیں وہ موجودہ میں نازک خیال اور معنی یاب شاعر تھے۔ مگر زمانہ کی ناقدری نے انھیں دہلی سے باہر نکلنے دیا سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء میں بمقام دہلی انتقال ہوا۔ ان کا دیوان سنہ ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا غالب کے رنگ میں قدیم طرز کی شاعری کرتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

(۱۴۱) غزل

کیا زلیخا ہو خوش گلستاں میں
دل تو اس کا پڑا ہے زنداں میں

یہ نزاکت اور اس پہ غیروں سے
کیسی مضبوطیاں ہیں پیماں میں

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق
خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں

ولولہ خیز ہے نسیم بہار
چپ ہوں کیونکر بلبلیں گلستاں میں

کس کو معلوم جان کب نکلی
محو تھے ہم تو یاد جاناں میں

وہ نگاہیں ہیں رخنہ گر ای شیخ ہاں سبکدستی جنوں ہشیار!		میرے سینے میں تیرے ایماں ہیں
دل خراشی ہو یا جگر سوزی		تار باقی رہے نہ داماں میں کچھ تو ہو شغل روزِ ہجراں میں
	دردِ دل کی نہیں دوا مجروح آپ ناحق ہیں فکرِ درماں میں	

(۵۷) زکی ۱۹۰۳ء

سید محمد زکریا خاں صاحب خلف سید محمود خاں نبیرہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور دہلوی مولف تذکرہ شعرائے اُردو سادات کشمیر سے تھے۔ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء دہلی میں پیدا ہوئے فن شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے ان کو مرزا نے اپنی تحریر میں جو زکی کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے اچھا شعر کہنے والا اور اپنا شاگرد رشید لکھا ہے۔ الہ آباد بریلی گورکھپور اور آخر عمر میں بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے وہیں ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں وفات پائی اور حضرت سید احمد صاحبؒ والد نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے باہر کی جنوبی دیوار کے زیر سایہ جانب مشرق دفن ہوئے۔ کلام یہ ہے:۔

(۱۴۲)

اسیری میں تباہی رونقِ کاشانہ ہو جائے	قفس ہی نالوں سے جل کر چراغ خانہ ہو جائے

تغافل ساز گا شوقِ اہلِ درد کیا ہوگا
ادا سے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار ہی ہو در معنی بیگانہ ہو جائے

بنیں کیوں حضرتِ موسیٰ کی بیتابی کے ہم پردہ
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افسانہ ہو جائے

خدا بزمِ جہاں میں دے وہ ذوقِ بادہ آشامی
کہ دورِ چرخ مجھ کو گردشِ پیمانہ ہو جائے

پھرے کیوں اُس کی بزمِ ناز سے محروم جانباز
رفیقِ شوق یارب ہمتِ مردانہ ہو جائے

کہاں تک ضبطِ بیتابیِ دل سکیں مجھے ڈر ہے
تری خوئے تحمل سے وہ بے پروانہ ہو جائے

تماشا عام ہوگا اور کیفِ بیخودی ارزاں
محبت کیا ہے قیامت صحبتِ مستانہ ہو جائے

ادائے حسن میں ہو دخل اندازِ محبت کو
دلِ صد چاک اُس کے گیسوں کا شانہ ہو جائے

جنونِ عشق بھی ہے علمِ حکمت ورنہ کیا معنی
جو دیوانہ ترا ہو جائے وہ فرزانہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچو اس کی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخیِ رندانہ ہو جائے

(۱۴۳)

ہوا میں بُرا کی بُرائی تمھاری
بگڑتے ہو کیوں تم بن آئی تمھاری

مرے ایک نالے میں گھبرائے ایسے
ہوئی کیا ستم آزمائی تمھاری

نہ مجھ سے چھٹے گی نہ تم سے چھٹے گی
محبت مری بے وفائی تمھاری

ملو بھی تو وحشت میں کیونکر ملوں میں
بجا ہے یہ ناآشنائی تمھاری

مرے اضطراب و قلق کی کشش کیا
یہاں تم کو شوخی ہے لائی تمھاری

وہ زلفیں کھلیں گی کہیں حضرتِ دل
ہوئی سخت مشکل رہائی تمہاری

حسینوں کو چھپ چھپ کے تم دیکھتے ہو
زکی دیکھ لی پارسائی تمہاری

(۵۰) داغ ۱۹۰۵ء

نواب میرزا خان دہلوی شاگرد رشید ذوق دہلوی ولادت دہلی محلہ بلی ماران ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء وفات حیدرآباد دکن میں بتاریخ ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۰۵ء یوم الحج۔ ان کے حالات اس قدر شہرت پذیر ہیں کہ حاجت تحریر سے بے نیاز ہیں انھوں نے اپنی زندگی ہی میں وہ ناموری حاصل کی کہ کسی کو کم نصیب ہوتی ہوگی تقدیر پیرانہ سالی میں ایسی چمکی کہ عہد سلطنت مغلیہ میں کسی کسی خوش تقدیر استاد کے ساتھ زمانہ موافقت کرجاتا تھا حضور نظام سادس بادشاہ دکن کی قدردانی اور تلمذ نے ان کو چار چاند لگا دیئے۔ متاخرین دہلی میں ایسی اچھی زبان ایسی حاضر طبیعت ایسی دل پذیر غزل گوئی شاید ہی کسی کو ملی ہو کہن مشقی نے ان کو تبحر علمی اور زبان عربی و فارسی کی مہارت سے بے نیاز کر رکھا تھا اچھے اچھے اساتذہ عصر کا کلام مشاعرے میں ان کے مقابل سرسبز نہ ہوتا تھا۔ یہ کچھ تو کلام کی برجستگی سادگی جذبات و تخیل کی خوبی تھی اور کچھ پڑھنے کا انداز ایسا اعلیٰ ترین تھا کہ باید و شاید اپنے اُستاد کی غزل قلعہ کے مشاعرے میں وہی پڑھا کرتے تھے اس لئے کہ اُستاد کو جہاں پناہ (ظفر) کی غزل پڑھنی ہوتی تھی

ایک مثنوی "فریادِ داغ" کہ یہ نام تاریخی ہے سنہ ١٣٠١ھ میں تصنیف کی چار دیوان شایع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں اور بچے بچے کی زبان پر اُن کا کلام ہے یہاں بطورِ نمونہ تھوڑا سا کلام پیش کیا جاتا ہے

(١٤٤) غزل

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

جورِ فلک میں خاک بھی لذت نہیں رہی
جی چاہتا ہے تیری جفائیں اُٹھائیں ہم

ڈر ہے نہ بھول جائے وہ سفاک روزِ حشر
دنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش
معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم

یاور کسے ہے یار کے چکر سے نصیب
لیتے ہیں اپنے پاؤں کی اکثر بلائیں ہم

تاثیر کو سلام کریں دونوں ہاتھ سے
جس وقت اپنے ہاتھ دعا کو اُٹھائیں ہم

سونپا تمھیں خدا کو چلے ہم تو نامراد
کچھ پڑھ کے بخشنا جو تمھیں یاد آئیں ہم

یہ جان تم نہ لوگے اگر آپ جائے گی
اس بے وفا کی خیر کہاں تک منائیں ہم

ان کو کہا جفا نہ کرو تم وفا کے بعد
ایسا نہ ہو کہ پھیر لیں اُلٹی دعائیں ہم

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
اے داغؔ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

(۱۴۵)

لذتِ سیرِ دگر چشمِ تمنا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

شکوۂ دہر نہ بیدادِ فلک کی فریاد
حشر میں خلقِ خدا نام تمہارا لے گی

لُٹ چکے جان و دل و صبر و خرد و زر و مال
کیا دھرا ہی شبِ غم آکے کہاں کیا لے گی

ایک مدت سے ہی برباد ہماری مٹی
دیکھیے کب ترے دامن کا سہارا لے گی

چین سے آپ ہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شبِ ہجر بلا ہی مجھے کھا لے گی

دل کا سودا تری زلفوں سے بنا رکھا تھا
کیا خبر تھی کہ نگہ مفت میں ہتھیا لے گی

کام بگڑا نہ بنائے سے بنے گا ہرگز
میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لے گی

شاہِ دیندار کا وہ فیض ہو جاری اے داغ
حشر تک سب سے مزے دین کے دنیا لے گی

(۱۴۶)

اے فلک چاہیے جی بھر کے نظارا ہم کو
جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارا ہم کو

کبھی ایما نہ کنایہ نہ اشارا ہم کو
کم نگاہی نے تری جان سے مارا ہم کو

ہم کسی زلفِ پریشاں کی طرح اے تقدیر
خوب بگڑے تھے مگر خوب سنوارا ہم کو

جب کھنچے اُن سے ہوئے اور زیادہ مضطر
مرضِ عشق کے پرہیز نے مارا ہم کو

شکر صد شکر کہ اب قبر میں ہم جا پہونچے
توسنِ عمر نے منزل پہ اُتارا ہم کو

روز تکرار کرے کون خریداروں سے
دل کی اس گرمیِ بازار نے مارا ہم کو

چل تو اے دل رہِ الفت میں کہیں راہ نما
مل رہے گا کوئی اللہ کا پیارا ہم کو

اب تو ہم تذکرۂ غیر پہ آفت ٹھہرے
پھر قیامت ہے جو چھیڑو گے دوبارا ہم کو

باتیں اس آئنہ رو کی بھی ہیں گویا کہ طلسم
آج تو خوب ہی شیشے میں اُتارا ہم کو

آپ سے اب نہ بنے گا کوئی سودا اپنا
پھیر دیجے دلِ بیتاب ہمارا ہم کو

ہم سیہ رو ہیں سوا مردمکِ چشم سے بھی
پر جو دیکھے تو کہے آنکھ کا تارا ہم کو

بدسلوکی میں مزہ کیا ہے مزا اس میں ہے
کہ ہمارا ہو تمھیں پاس تمھارا ہم کو

بحرِ ہستی میں ہوئے کشتیِ طوفانی ہم
نہیں ملتا کہیں اے داغ کنارا ہم کو

(۱۴۷)

ثبات بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین دیکھا نہ خواب آیا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

طرب میں جس سے ہو جانِ محزوں اُسی کو گردش ہی ہو پُرخوں
کہ چرخ زن مثلِ دورِ گردوں مدام جامِ شراب دیکھا

نظر میں ہر تیری کبریائی سما گئی تیری خودنمائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی مگر نہ تیرا جواب دیکھا

پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکرِ دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

یہ دل تو اے عشق گھر ہی تیرا کہ جس کو تو نے بگاڑ ڈالا
مکاں سے تا لامکاں جو دیکھا تجھی کو خانہ خراب دیکھا

سرورِ عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا

جو تجھ کو پایا تو کچھ نہ پایا یہ خاکداں ہم نے خاک پایا
جو تجھ کو دیکھا تو کچھ نہ دیکھا تمام عالم خراب دیکھا

شرابِ غفلت سے داغ غش تھے کھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

(۱۴۸)

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو بہا کے جانا
ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا
کہاں کا آنا کہاں کا جانا وہ جانتے ہی نہیں یہ رسمیں
وہاں ہے وعدے کی بھی یہ صورت کبھی تو کرنا کبھی نہ کرنا
لئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا
نہیں ہے آسان قتل ان کا یہ سخت جاں بھی بری بلا ہیں
قضا کو پہلے شریک کرنا یہ کام اپنی خوشی نہ کرنا
ہلاک اندازِ وصل کرنا کہ پردہ رہ جائے کچھ ہمارا
غمِ جدائی میں خاک کر کے کہیں عدو کی خوشی نہ کرنا
تو ہی بات نہ ہر ان کو وہ ان کے مطلب ہی کی نہ کیوں ہو
کہ ان سے جو التجا سے کہنا غضب ہے ان کا وہی نہ کرنا

ہوا ہے گر شوق آئنہ سے تو رُخ رہے راستی کی جانب
مثالِ عارض صفائی رکھنا بزنگِ کاکل کبھی نہ کرنا
وہ اک ہمارا طریق الفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا
یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا
ہم ایک ستہ گلی کا اس کی دم کہا کے دل کو ہوئے پشیماں
یہ حضرتِ خضر کو جتا دو کسی کی تم رہبری نہ کرنا
بیانِ دردِ فراق کیسا کہ ہے یہاں اپنی یہ حقیقت
جو بات کرنی تو نالہ کرنا نہیں تو وہ بھی کبھی نہ کرنا
مدار ہے ناصحو تمھیں پر تمام اب اس کی منصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروری نہ کرنا

بُری ہے اے داغ راہِ اُلفت خدا نہ لیجائے ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

(۵۹) محسن ۱۹۰۵ء

مولوی محمد محسن خلف مولوی حسن بخش علاوی۔ آپ قصبہ کاکوری کے ایک بہنا [illegible]
کے رکن تھے جو عہد ماضیہ میں علمی اعتبار سے نامور تھا وہ اس کے فضل و کمال کی

میں شہرہ تھا ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کلام جوانی میں مولوی ہادی علی صاحب شاگردِ برق لکھنوی کو دکھایا۔ اس کے بعد نعت گوئی میں طرزِ خاص کے موجد ہو گئے۔ اور دورِ حاضرہ کے شعرا میں ایک فردِ کامل تھے۔ مین پوری میں وکالت کرتے تھے ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔ زبان کی صفائی کے ساتھ کلام سوز و گداز اور جذبات سے پُر ہوتا ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

(۱۴۹) عشق و محبّت کی بے چینی کا نقشہ

ایک نظر مہر کی مجھ پر ساقی — ماہ رو آئینہ پیکر ساقی
مہرباں تشنہ لبوں پر ہو جا — دل کی لہروں کا سمندر ہو جا
کشتیِ مے نہ چلے میرے بغیر — میرے دریا تیرے بیڑے کی خیر
کر دے سرشار مجھے جی بھر کے — دے صراحی پہ صراحی بھر کے
گردشِ جام شرر ہے ساقی — دم آبے دم آبے ساقی
غرق کرتا ہے تلاطم مجھ کو — آج للہ کوئی خم مجھ کو
یہ بھی اک شفقت بے ڈھب ساقی — پار کرتا ہے مخاطب ساقی
چھینٹے دے دے کے جو لاتا ہے مجھے — غیر بن بن کے بناتا ہے مجھے
ہیں یہ کیا رنگ تمہارے محسن — دوست کیوں ہو گئے پیارے محسن

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری — یار کیا ہو گئی حالت تیری
اُڑ گیا رنگ ترا بو ہو کر — بہہ گیا خونِ دل آنسو ہو کر
حیف حالت تری دُکھ پائی ہوئی — ہائے صورت تری مُرجھائی ہوئی
لب پہ آئے ہوئے نالے پیہم — ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پُرنم
چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں — عرق آیا ہوا پیشانی میں
زردی چھائی ہوئی رخساروں پر — سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
مُردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو — اپنی جاتی ہوئی دنیا دیکھو
چھپ گیا چاند ستارا ہو کر — اُڑ گیا آئنہ پارا ہو کر
ہر دم اک رنگ بدلتا ہے کیوں — شمع کی طرح سے جلتا ہے کیوں
یہ انگرکھے ترے گلکاری کے — جن کی کلیوں میں چبھے ہیں کانٹے
کامدانی کا پہننا چھوڑا — لُٹ گیا تیرا شہانا جوڑا
رنگ اُڑ اُڑ کے بکھر جانے لگا — ناتوانی کو بھی غش آنے لگا
بند آنکھیں کیے روتے دیکھا — رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا
کس بلا کا تو ہوا ہے مجنوں — لیلیٰ کہتی ہے بلائیں لیلوں
کوہ پر جا کے اگر سر مارے — کوہکن بھی تجھے پتھر مارے
باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو — آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
کبھی ملتے ہو تو بیگانے سے — کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے

شہر کا سیر تماشا چھوڑا — چاندنی چوک کا رستہ چھوڑا
رکھا دیئے موسمِ گل ہیں کیوں کر — طاقِ نسیاں پہ سنہرے ساغر
آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے — باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے
بیٹھے جنگل میں نہ یکسو ہو کر — کالے کوسوں پہ آئے ہو ہو کر
نجد میں بیر اگلا ہوتا ہے — قیس لیلےٰ پہ خفا ہوتا ہے
کسی بُت نے تجھے حیران کیا — کسی کافر نے مسلمان کیا
مجھے بتلائیے یہ سودا تجھ کو — کیا ہوا میرے کنہیا تجھ کو
دیکھ بھر آئیں تری پھر آنکھیں — یاد آئیں تجھے کافر آنکھیں
خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی — ہیں مری جان یہ آہیں کیسی
بگڑی کیوں ہیں مرے بسمل چتون — یاد آئی کوئی قاتل چتون
عشقِ گیسو نے یہ عقدہ کھولا — سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا
جال پھیلائے ہیں منتر والے — بال کھولے ہوئے گھونگر والے
جان لیتے ہیں نکھرنے والے — تم سلامت رہو مرنے والے
دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں — جان کی فکر مرے جانی کیوں
آبرو کی نہ تجھے پروا کب تک — ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو — تم تو بے پیئے متوالے ہو
سو کہیں ایک نہ مانی آخر — مٹ گئی تیری جوانی آخر

چاندنی پچھلے پہر کی کب تک	روشنی شمعِ سحر کی کب تک
دلِ ناشاد کو رکھتا ہوں میں	نہ بھی یار نہ ہو پہلو میں
بس مجھے آتے ہیں چکر ساقی	لے گرے ہاتھ سے ساغر ساقی
ہاتھ لینا مجھے غش آتا ہے	دل کہیں اور لیے جاتا ہے
تیری محفل کا یہی طور رہے	دَور جب تک ہے یہی دَور رہے

(۶۰) ارشد سنہ ۱۹۰۶ء

ارشد صاحب عالم میرزا عبد الغنی گورگانی دہلوی خلف میرزا علی بہادر سلسلہ نسب حضرت احمد شاہ بادشاہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کی پیدائش قلعہ دہلی میں ہوئی غدر میں چھ سات برس کی عمر تھی شاہزادہ میرزا قادر بخش صاحب سے علم عروض حاصل کیا اور فن سخن میں ان کے شاگرد ہو گئے شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں کامل استعداد تھی۔ مرثیہ سلام پڑھنے کا شوق تھا۔ تاریخ گوئی میں کامل تھے طرز قدیم کے علاوہ جدید طرز میں بھی نظم لکھتے تھے۔ سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم تھے ان کی عمر کا زیادہ حصہ فیروزپور میں گزرا تھا ۱۲ فروری سنہ ۱۹۰۶ء مطابق سنہ ۱۳۲۴ھ کو ملتان میں انتقال کیا کوئی دیوان نہیں چھپا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۱۵۰)

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے روئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر

اُگا ہے پنجۂ مرجاں جو اپنی خاکِ مدفن پر
تو وقتِ فاتحہ ہے بدگماں کا ہاتھ دامن پر

نظر مجھ کو عجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پر

وہ بے انصاف اور اپنی وفا کی داد یا قسمت
گماں دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

نہیں کھلتا نہیں کھلتا کہ مجھ سے کیا رکاوٹ ہے
کہ کچھ رُک رُک کے چلتی ہے تری تلوار گردن پر

عجب اُس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

میں ہوں مرہونِ منتِ صلحِ کل کا جب سے اے آرشد
یقینِ دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

(۶۱) راسخ ۱۹۰۷ء

مولوی حافظ عبدالرحمن راسخ دہلوی خلف دوم مولوی محمد حسین فقیر۔ ان کے دادا مولوی محمد اسمعیل مدار المہام ریاست پالودی کا اصلی وطن سامانہ علاقہ ریاست پٹیالہ تھا۔ کچھ عرصہ تک بستی قصبہ مظفر نگر میں سکونت اختیار کی اس کے بعد دہلی آ گئے۔ مولانا راسخ کے والد خاقانی ہند استاد ذوق کے شاگرد تھے انھیں سے استفادہ سخن کیا۔ مولانا راسخ نے نویں سال کلام مجید حفظ کر کے مسجد میں محراب سنادی تھی۔ نثر نگاری اور شعر و شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اسی سلسلہ میں بے مثال پنچ جاری کیا۔ خیر خواہ عالم جلتا پرزہ افضل الاخبار اور دہلی پنچ کی ایڈیٹری کی۔ مگر چونکہ ان کے والد دوران طالب علمی میں ان اشغال سے ناخوش تھے اس لیے حصول تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ فضیلت کی سند حاصل کی اور وعظ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ اسی زمانے میں مثنوی مولانا روم کی نظم کی شرح لکھی جس کے دو دفتر شایع بھی ہو گئے۔ آخر میں اردو شاعری ترک کر دی تھی کبھی کبھی فارسی میں کچھ لکھ لیتے تھے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء مطابق ۱۳۲۵ھ بعمر ۴۴ سال انتقال کیا اور مہندیوں کے قبرستان میں حریم محدثین کے اندر شرقی دیوار کے زیر سایہ دفن ہوئے مرات الخیال اور کمال راسخ دو مطبوعہ دیوان ان سے یادگار ہیں۔ اولاد نہیں چھوڑی۔

(۱۵۱) غزل

کہاں سے تھے شب ادھر دیکھو حیا کیوں ہے نگاہوں میں

اگر منظور رہی رکھ لو نہ مجھے جھوٹے گواہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

موحد وہ ہوں گر میں سرِّ وحدت کان میں کہہ دوں
موذن بُت کدہ میں ہوں برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چرا کر مُنہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

تعجب کیا ہی نکلے کوئی دن میں ماہ بھی ٹیڑھی
غضب کا بانکپن دیکھا ہی ہم نے کج کلاہوں میں

نہ میں عرشِ بریں پر ہوں نہ میں فرشِ زمیں پر ہوں
مری ہستی ہی گویا نیستی میری نگاہوں میں

بتوں کے بوسے دے دے کر عدو کو کیوں مکرتے ہو
زباں شامل نہ ہو جائے کہیں جھوٹے گواہوں میں

عدو مِل جُل کے گر مجھ سے کریں نالے تو اچھا ہی
ملے دادِ ستم ایکا اگر ہو دادخواہوں میں

حجابِ دیدۂ خودبیں، حجابِ خاطرِ بدبیں
پڑے رہتے ہیں یہ پردے تمھاری جلوہ گاہوں میں

ہماری طرح تم پر بوالہوس مرکیوں نہیں جاتے
اگر ہیں جاں نثاروں میں اگر ہیں دادخواہوں میں

دبا کر رکھ لیا ہے چال میں محشر کے فتنوں کو
جگا کر رکھ لیا ہے شوخ نے جادو نگاہوں میں

جگر بھی خوش ہے دل بھی خوش کہیں بیٹھیں کہیں نکلیں
غضب کی میٹھی چھریاں ہیں تری نیچی نگاہوں میں

وہی اسلحؔ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے فرباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چاروں سے دیں پناہوں میں

(۶۲) شہباز ۱۹۱۵ء

مولوی سید محمد عبد الغفور خلف سید طالب علی ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے ابتدا سے مضمون نگاری کا شوق تھا اخبار دار السلطنت و اُردو گائڈ کلکتہ کے اڈیٹر رہے تھے۔ اس کے بعد ریاست حیدرآباد میں تعلق ہوگیا، یہاں اورنگ آباد کالج میں پروفیسر کے عہدے پر ممتاز رہے بھوپال میں سر رشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے اُردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی برجستہ شعر کہتے تھے آپ اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ممتاز نامہ نگاروں میں تھے آپ کی نظم کا مجموعہ خیالات شہباز کے نام سے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں چھپا ہے ان کی نظموں میں فلسفہ انسانی کی باریکیاں اور قدرت کے نکات صاف اور ستھری زبان میں

نظر آتے ہیں۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۶ھ کو وفات پائی۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے:-

(۱۵۲) سمندر

بڑی ہی اک عظیم الشان شے ہے — پڑے جس میں کروڑوں ابنِ طی ہے
ہزاروں جس میں مخفی گنجِ شاہی — کروڑوں جس میں اسرارِ الٰہی
زیادہ جس کی گہرائی خرد سے — عیاں جس کی اونچائی شدومد سے
خیالوں سے بڑا پھیلاؤ جس کا — سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا
فلک جس کے قدم لینے کو جھک جائے — زمانہ جس پہ دم لینے کو رک جائے
ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں — بلاگرداں ہو جس کا مہرِ گردوں
گھٹا جھکی ہوئی جس کی بدولت — شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت
پہاڑوں کو جہاں وڑوں کا رتبہ — جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ

جہاں طوفانِ نوح اک موجِ نوخیز
جہاں خود چشمِ قدرت حیرت آمیز

(۱۵۳) صبحِ پیری

کیا جانے سر کے بال تھے مدت سے کیوں سپید — نزلہ جھکا وہ ریش پہ اب یہ غضب ہوا
سمجھے یہ مو نہیں ہیں طنابیں ہیں نور کی — خیمہ سحر کا آن گڑا کوچ شب ہوا
اب کیجیے جلکے معرکۂ زندگی کے کام — ہونا تھا جتنا بزم میں عیش و طرب ہوا

کیا دیکھیے آئنہ کوئی منہ ہی نہیں ہو جب	بیکار ہے جو قبضے میں شہر حلب ہوا
آنکھوں کی دوربینوں میں بھی اب نہیں وہ زور	دانتوں کا بھی حصار مرمت طلب ہوا
جاسوس کان کرے پڑے سوتے ہیں بے خبر	ان کی بلا سے ہر میں شغب و شغب ہوا
طاقت کہاں بیان ہیں کیجے گلوں کو طول	مجبوریوں سے ردِ زباں شکر رب ہوا
وہ دن کہاں کہ صبح سے ہو سیر چوک کی	بازارِ عیش گرم جہاں وقتِ شب ہوا
پاؤں کرے اہوا کہ اٹھاتے نہیں قدم	کمری جو تاب بیک نہ ہوئے کیا سبب ہوا
امعا جو بگڑے پھر نہ ہوئے ایک مستقیم	معدے میں گرچہ ہضم مسلم مطلب ہوا
شہباز کو کہ فرض سے تھا دور جو بزرگ	کیونکر خیالِ نافلہ و مستحب ہوا
جب تک رہا وہ ہند میں تھا شیخ فاسقاں	کعبے گیا تو قبلۂ شیخ العرب ہوا

(۶۳) راقم ۱۹۰۹ء

خواجہ قمر الدین دہلوی بدرالدین مترجم بوستان خیال کے بیٹے تھے مرزا غالب مرحوم کے شاگرد ریاست جے پور کے وظیفہ خوار تھے آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر وہیں چلے گئے تھے اُن کا دیوان ۱۲۹۰ھ میں افضل المطابع دہلی میں طبع ہو چکا ہے۔ ۱۹۰۹ء کے قریب انتقال ہوا ان کی ایک کتاب تعلیم فسوں میں "عقد ثریا" کے نام سے یادگار ہے۔

(۱۵۴) غزل

بات کیونکر بنے اُمید بر آئے کیوں کر	نالہ پر شور نہیں آہ شرربار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکوؤں کا لینے وہ حساب
مجھ سے نفرت ہی لذت کشِ آزار تو ہوں

خیر ہی ہاتھ میں اُن کے کوئی تلوار نہیں
غیر ہیں غیر ہی وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہی چلو خانۂ خمار نہیں

(۶۴) حبیب ۱۹۰۹ء

محمد کاظم آپ کا سلسلۂ نسب سید حمزہ ابن موسیٰ کاظم علیہ السلام تک پہونچتا ہی اور قصبہ کنتور ملک اودھ کے رہنے والے گیارہ برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق ہوا سب سے پہلے اپنا کلام سید لطف اللہ قدر شاگرد ناسخ کو دکھایا پھر سید حسین مرزا عاشق لکھنوی سے استفادۂ سخن حاصل کیا جو ناسخ کے قابل شاگرد تھے آپ ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے ۱۹۰۹ء میں وفات پائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہی:۔

(۱۵۵) غزل

حُسن جب صورت گرِ ذوقِ خود آرائی ہوا
ہر بُتِ بے باک گرمِ لافِ یکتائی ہوا
عشق نے سارے زمانے کو بنایا بدگماں
خود بخود میرا تڑپنا وجہِ رُسوائی ہوا

اک جہاں شیدا ہی صورت آشنا کوئی نہیں
سب کو اپنا کرلیا کس کا وہ ہرجائی ہوا
کچھ بجز غفلت نہ ہاتھ آیا متاعِ دہر سے
مالِ دُنیا صرفِ شغلِ بادہ پیمائی ہوا
دست قدرت نے دکھائیں اپنی شکلیں کھینچکر
کوئی ازخود رفتہ اور کوئی تماشائی ہوا
کون ہوسکتا تھا دُنیا میں کسی کا روشناس
چھپ کے ہر پردہ میں تو وجہِ شناسائی ہوا

ای مسبب نور کردے رنج و حرمانِ حبیب
وہ بھی کوئی شی ہی جس کا یہ تمنّائی ہوا

(۶۵) جلال ۱۹۰۹ء

سیّد ضامن علی خلف حکیم اصغر علی لکھنوی۔ مرزا برق و رشک شاگردان ناسخ کی تلامذہ میں تھے تحقیق میں اچھی دستگاہ تھی ان کی تصانیف ان کی قابلیت کی شاہد ہیں۔ منتخب اللغات افادۂ تاریخ۔ رسالہ عروض سرمایہ زبان اُردو (لغت) اور تین دیوان اُن سے یادگار ہیں اُنھوں نے اپنی وفات پر لکھنؤ میں اپنا ہمسر کوئی نہ چھوڑا۔ ۱۳۲۷ھ

مطابق ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا بہت سے شاگرد چھوڑے۔

(۱۵۶)

جذبِ دل کھینچ اسے دست و گریباں ہو کر
دے جگہ یار کو پہلو میں رگِ جاں ہو کر

خوش نگاہوں کے کرشمے کوئی ہم سے پوچھے
آنکھ میں کرتے ہیں گھر آنکھ سے پنہاں ہو کر

دستِ وحشت سے کہوں گا کہ اسے بھی کر چاک
دل مجھے تنگ کرے گا جو گریباں ہو کر

حسرتِ ناوکِ قاتل میں جو دل بھر آیا
آنسو آنکھوں میں کھٹکنے لگے پیکاں ہو کر

نزع میں اس لئے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ
روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہو کر

ہائے اس شوخ کی شرمندگیِ جور و ستم
مار ڈالا ہمیں ظالم نے پشیماں ہو کر

محفلِ یار سے کیوں کر نہ نکالے جاتے
ہم گئے تھے ہمہ تن حسرت و ارماں ہو کر

سبب وفائی ہیں نہ تھا یارسے کم عہدِ شباب
چل دیا صبح کو اک رات کا مہماں ہوکر

نہ رہے ہم سے سیہ بخت تو کیا غم ہے جلالؔ
دیکھیے رہتی ہے کس کی شبِ ہجراں ہوکر

(۱۵۷)

اُس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے
کسی بے درد کو میں حال سنا لوں اپنا
یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سو داغ
نامرادوں کی ہوئیں آج مرادیں پوری
شرح جنت میں شدائے ہم بیٹھ ہم مدفن میں
اب کسی سے یہ کہیں گے کہ نہیں رنج ہی رہے

وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے
نالہ خاموش رہے چپ بھی فریاد رہے
تلو وفا میں مری اور اک نہ اسے یاد رہے
ہم کو ناشاد لقب اپنے دیا شاد رہے
تیرے آوارہ پسِ مرگ بھی برباد رہے
شاد ہونے کی تمنا میں تو ناشاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ تیری وفاؤں کو جلالؔ
غنیمت ہے کہ جور اپنے انھیں یاد رہے

(۶۶) آزاد سنہ ۱۹۱۰ء

پروفیسر مولوی محمد حسین آزاد شمس العلماء۔ ان کے والد کا نام محمد باقر تھا جو شمر فاز دہلی

ہیں ایک مشہور شخص تھے انھوں نے سنہ ۱۸۹۶ء میں اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار دہلی سے شائع کیا تھا وہ شاعر بھی تھے اور استاد ذوق سے تلمذ رکھتے تھے لیکن ان کا کلام مشہور نہیں ہوا نہ دیوان چھپا ان کو اردو نثر میں اپنے خاص رنگ کے سبب بہت کچھ شہرت حاصل ہوئی شاہراہِ قدیم سے ہٹ کر اردو شاعری میں ایک جدید روش پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے انہیں کو آیا تھا۔ آزاد کی طرزِ تحریر نظم و نثر دونوں کسی تعریف کی محتاج نہیں بیان کی لطافت زبان کی سلاست بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی سب کچھ ان کے یہاں موجود ہے ان کی کثیر تصنیفات میں دربار اکبری نیرنگ خیال سخندان پارس۔ آبِ حیات مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کا کچھ کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے چھپ گیا ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں ایک دماغی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن اس وقت بھی عالمانہ خیالات ہی دماغ میں چکر لگاتے تھے جس کی جھلک سیاک نماک میں پائی جاتی ہے جو اسی زمانہ جنون کی تصنیف ہے سنہ ۱۹۱۰ء مطابق سنہ ۱۳۲۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔

کلام کا انتخاب ہے:-

(۱۵۸) خسروِ امن کا دربارِ علم

دفعتاً دیکھا کہ اک پیرِ کہن سال آئے
پر عجب شان سے وہ مردِ خوش اعمال آئے

جسم پر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا
ان کی مقدارِ فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغریِ چہرہ پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریشِ مقدس میں کیا پیری نے
اوڑھ رکھا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اٹھائے آئے
اور بغل میں کئی جزدان دبائے آئے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے
ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے
پہلے سب نے باادب دستِ دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آتے ہیں کالت کے لئے
علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لئے

اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا
ہے ہر اک شہرتِ تعریف میں مصروف سدا

اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں
اور جہلا میں بھی فکرِ سحر و شام نہیں

دم بدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے
آتے ہیں کارگہِ دہر میں استاد نئے

درس و تدریس کے چرچے ہیں جو گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیتِ خاطر ہی کی باتیں ساری

جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہِ امن یہ سب فیض و کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہو تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازہ اوراق پریشاں ہو جائے

(۱۵۹) زمستان

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ تخ ہو کے جم گئے

داماں کو ہر سا میں سورج بھی لپیٹ کر
دبکا غلافِ برف میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر کو سب در و دیوار تھے سفید	باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید
سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں	چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا	ہے یہ ڈر کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے بہک گئی	خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آرہیں	جو زیر و بم کے دور سے ہیں سر ملا رہیں

(۱۶۰) صبح کا سماں

ناگہ فلک پہ دامن شب چاک ہو گیا	لبریز نور سے طبق خاک ہو گیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا	گلگونہ لے کے سامنے رنگ شفق ہوا
نئی سحر یہ شان تھی نور و ظہور کی	چاروں طرف تھی زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں	اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا	اور جھوم جھوم کر وہ رخ گل کا چومنا
سبزی جو ہوئے خاک پہ مخمل بچھا گئی	شبنم بھی آ کے رات کو موتی گرا گئی

پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے

(۶۷) سرور ۱۹۱۰ء

منشی درگا سہائے ولد حکیم پیارے لال قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے باشندے تھے وہیں سنہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے زمانہ طالب علمی سے اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کا شوق تھا فطرت نے شاعری کا جو مادہ طبیعت میں ودیعت کیا تھا اس مطالعہ سے وہ اُبھر آیا اور خود بھی شعر کہنے لگے زیادہ تر نیچرل نظمیں کہتے تھے جن کو ہندوستان کے ماہوار اردو رسالے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے بسنہ ۱۹۱۱ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ "زمانہ پریس" کانپور میں چھپا ہے ۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء مطابق سنہ ۱۳۲۸ھ کو ۳۷ سال کی عمر میں جوان فوت ہو گئے۔

کلام کا انتخاب ہے:-

(۱۶۱) دلِ بے قرار سو جا

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری دلِ بے قرار سو جا

یہ تری صدا اے نالہ مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا مرے رازدار سو جا

مجھے خوں رُلا رہا ہے ترا دم بدم تڑپنا
ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سو جا

ابھی دھان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا

نہ تڑپ نہیں پہ ظالم تجھے گود میں اُٹھا لوں
تجھے سینہ سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سو جا

تجھے جن کا ہے تصور ارے مستِ جامِ الفت
اُنھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے شبِ غم بُری بلا ہے
کہیں مرِ مٹے نہ ظالم دلِ بے قرار سو جا

(۶۸) ظہیر ۱۹۱۱ء

نواب مرزا سید ظہیر الدین حسین دہلوی خلف اکبر سید جلال الدین حیدر صلاح الدولہ مرصع رقم خاں اُستاد بہادر شاہ ظفر مرحوم خاقانی ہندوستان کے نامور شاگرد تھے دربار شاہی

سے چودہ سال کی عمر میں "راقم الدولہ" کا خطاب مع قلمدان شاہی عطا ہوا تھا۔ دور موجود کے اساتذہ دہلی میں سربر آوردہ تھے۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی۔ مسدس۔ مخمس۔ مثنوی۔ غرض جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ غدر کے بعد سے ریاست جے پور میں چلے گئے تھے وہاں کچھ دنوں رہے اس کے بعد ریاست ٹونک میں ملازم ہو گئے۔ غفران مآب ہزہائی نس میر محبوب علی خاں والی دکن کی قدر افزائی کا شہرہ سن کر ریاست حیدر آباد میں تشریف لائے دربار تک رسائی نہ ہونے پائی تھی کہ علیل ہو گئے اور مارچ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ میں انتقال فرمایا تین دیوان شایع ہو چکے ہیں۔

کلام یہ ہے:-

غزل (۱۶۲)

گل افشانی کے دم بھرتی ہے چشم خوں فشاں کیا کیا
بہار زیب دامن ہے بہار گلستاں کیا کیا

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

دل خوں گشتہ حسرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
بہار آگیں ہے کچھ اب کے برس فصل خزاں کیا کیا

جنوں سے کم نہیں ہے کچھ ہجوم شادمانی بھی
ہوائے گل میں ہے جامہ سے باہر باغباں کیا کیا

تصوّر میں وصالِ یار کے سامان ہوتے ہیں
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
چلی آتی ہے اتراتی ہوئی کچھ کوئے جاناں سے
بسی ہے رشک کی بو میں نسیمِ بوستاں کیا کیا
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

ظہیرِ خستہ جاں سچ ہے محبّت کچھ بُری شَے ہے
مجازی میں حقیقی کے ہوئے ہیں امتحاں کیا کیا

(۱۶۳)

یہ رنگِ الفت اگر نہ ہوتا تو کچھ خدائی میں کم نہ ہوتا
کسی پہ کوئی نہ جان دیتا کسی پہ جور و ستم نہ ہوتا
عدو جو شایانِ ظلم ہوتے تو لطفِ دُود و الم نہ ہوتا
مزے محبّت کے کون لیتا جو میں قتیلِ ستم نہ ہوتا
اگر نہ کرتے وہ کج ادائی تو کچھ عداوت بے کم نہ ہوتا
جو یہ نہ ہوتی تو کیا نہ ہوتا جفا نہ ہوتی ستم نہ ہوتا

غلط ہی شکوہ کہ وہ نہ آئے مجھے تو ہر طرح موت آتی
اگر وہ آتے تو جی نہ جاتا کہ فرطِ شادی سے دم نہ ہوتا
یہ کہیے اپنا ہی جی نہ چاہا وگر نہ خوفِ رقیب کیا تھا
کہ آپ آتے تو اڑ کے آتے زمیں پہ نقشِ قدم نہ ہوتا
غضب ہے شورش تپش قیامت ہوا ہے دوزخ سے سوزِ الفت
وگر نہ جانِ حزیں پہ اتنا کبھی عذابِ الم نہ ہوتا
اگر عدو پر عذاب ہوتا نہ دل میں یوں پیچ و تاب ہوتا
جبیں پہ ہر دم شکن نہ پڑتی شکن سے ابرو میں خم نہ ہوتا

ظہیر ملتی نہ راہِ ایماں جو کفر کرتا نہ رہنمائی
لبوں پہ یادِ خدا نہ ہوتی جو دردِ ہجرِ صنم نہ ہوتا

(۶۹) آصف ۱۹۱۱ء

ہز ہائی نس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سادس۔ آپ ۱۸ اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء میں کچھ کم تین برس کی عمر میں باقاعدہ تخت نشین ہوئے، انگریزی، عربی، فارسی سے بخوبی واقف تھے اور لڑکپن سے علمی مذاق میں فرد و یگانہ تھے۔ شکار کا نہایت شوق تھا شعر و سخن سے آپ کی

طبیعت کو خاص مناسبت تھی حضرت داغ دہلوی مرحوم اس فن میں مشورہ دیتے تھے شعر میں سلاست زبان و مضمون آفرینی کا لحاظ رکھتے تھے۔ تاریخ وفات ۹ اگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ ہے۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ کلام یہ ہے:-

(۱۶۴) غزل

یہ دل آشنا اور نا آشنا ہے ۔ بھلوں سے بھلا اور بروں سے برا ہے
نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے ۔ زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہے
پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزا ہے ۔ یہ شیشہ بھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے
مزا ہے یہی بات میں بات نکلے ۔ ادا سے ادا جب ہو پھر تو کیا ہے
نشانہ بنے دیکھیے کونسا دل ۔ یہ تیرِ دعا ہے وہ تیرِ ادا ہے
کریں بت کدہ سے عبث قصدِ کعبہ ۔ یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے
کہاں جائے انسان ان سے نکل کر ۔ زمیں فتنہ گر ہے فلک فتنہ زا ہے
شبِ وصل کس طرح طے ہو یہ جھگڑا ۔ نہ تم مانتے ہو نہ دل مانتا ہے
کہو پھر تو گھبرا کے ذکرِ عدو پر ۔ نہیں ہم تو واقف خدا جانتا ہے
یہ کافر حسیں اک جگہ جمع ہوں گے ۔ جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہے
بہت دور ہے منزلِ دشت اے دل ۔ جو یہ طے ہوئی پھر خدا ہی خدا ہے
کوئی بے وفاؤں کے دم میں نہ آئے ۔ محبت جو کی تھی یہ اس کی سزا ہے

ہمارے بھی ہے امتحاں میں آصفؔ
لگا نا ہے دل کا سراسر خطا ہے

(۷۰) تسلیم ۱۹۱۱ء

شیخ امیر اللہ خلف مولوی عبد الصمد صاحب فیض آبادی شاگردِ رشید میرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی آپ ۱۸۱۹ء میں جبکہ غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے تھے پیدا ہوئے عرصہ دراز تک لکھنؤ میں رہے وہاں کے مشاعروں میں شرکت کی اہلِ سخن سے صحبت گرم رہی اس کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں رام پور تشریف لائے اور مشاہیر شعرا میں اپنی بلند خیالی او رسخن سرائی کی داد پائی آپ کے ۳ دیوان اور مثنویات نالۂ تسلیم دل و جان۔ صبح خنداں طبع ہو چکی ہیں دورِ موجودہ کے شعرا میں نامور تھے۔ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

(۱۶۵) غزل

قیامت کی ہے بے تابی سرشکِ چشمِ گریاں میں
کبھی پہلوئے مژگاں میں کبھی آغوشِ داماں میں

دمِ طفلی سے میں ہوں آشنائے مرگِ دوراں میں
فلک نے مجھ کو پالا دامنِ شمشیرِ عریاں میں

بنی ہی یہ میرے دم پر کہ ہیں پچھلے پہر آخر
اجل کو ڈھونڈھنے نکلا شبِ تاریکِ ہجراں میں

نظر کر ای ستم گر ربطِ باہم اِس کو کہتے ہیں
کہ پیکاں دل میں ہی دل نازبردارِ پیکاں میں

ہُوا میں زندۂ جاوید ہو کر قتل ای قاتل
بجھی تھی کیا تری شمشیر موجِ آبِ حیواں میں

جھکا دو شرم سے عالم دکھا کر قدِّ موزوں کا
اُٹھا یا ہی بہت سروِ سہی نے سر گلستاں میں

چلو گھر خاک بھی ڈالو حنا کا خون ہوتا ہی
کفِ افسوس ملتے ہو کھڑے گنجِ شہیداں میں

حسینوں سے بگڑنا اور دل کو داغ دیتا ہی
بہت روئی زلیخا بھیجکر یوسف کو زنداں میں

ڈراتا کیوں ہی ای تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہی کیا خدا کے فضل و احساں میں

(۷۱) بیخود

بیخود۔ مولوی عبدالحی تخلص بیخود خلف مولوی غلام صمد صدیقی بدایونی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی سے بخوبی ماہر تھے۔ دونوں زبانوں میں عمدہ استعداد رکھتے تھے۔ خوش رو۔ خوش لباس۔ زندہ دل۔ رنگیں مزاج شاعر تھے۔ اساتذہ گزشتہ کے ذوقِ سخن سے آشنا ہو کر خود بھی معنی آفرینی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ سب سے پہلے حضرت حالی مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں جناب داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان کا کلام صفائی بیان اور زبان سے مالا مال ہے پہلے شاہجہانپور میں وکالت کی آخر عمر میں ریاست جودھپور میں مجسٹریٹ تھے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۱ھ میں انتقال ہوا۔ بدایوں میں حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے بیرونی چبوترہ پر دفن ہیں

کلام یہ ہے:۔

(۱۶۶) غزل

درد دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی دشمنی نہ ہو جائے

کہتے ہو کوئی ہم کو دل کیوں دے
کہیں سچ مچ یہی نہ ہو جائے

تم مری دوستی کا دم نہ بھرو
آسماں مدعی نہ ہو جائے

کج ادائی تری ادا ٹھہری
میری نیکی بدی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہوں ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالع بد وہاں بھی سانس نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

حشر پر دید کیوں اٹھا رکھی
ہونے والی ابھی نہ ہو جائے

بھول جائیں نہ وہ جفا اپنی
یہ ہوئی ان ہوئی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

کہیں بیخود تمہاری خود داری
مانعِ بیخودی نہ ہو جائے

(۱۶۸) قطعہ

ازل میں داد و دہش کا جو حکم عام ہوا
تو سب کو مالِ ضروری علی الحساب ملا

کسی کو عالمِ طفلی کا عیش اور آرام
کسی کو راحتِ عشرت بھرا شباب ملا

کسی نے دولت ایمان و آرزو پائی
کسی کو خلعتِ اندوہ و اضطراب ملا

کسی کے بانٹ میں قسمت سے شوخیاں آئیں
کسی کو شرم عنایت ہوئی حجاب ملا

کسی کی جان کو تکلیفِ انتظار ملی
کسی کے دل کو غمِ ہجر کا عذاب ملا

کسی کو پردہ نشینوں کا غم نصیب ہوا
کسی کو عشقِ رخِ یارِ بے نقاب ملا

جو عاصیوں کے اجارے میں معصیت آئی
تو زاہدوں کو طریقِ رہِ صواب ملا

کِسی کی بات نے اعجازِ عیسوی پایا
کِسی کو ذوقِ کبابِ جگر حصول ہوا
کِسی نے عشوہ گر و کج نظر لقب پایا
کِسی کے بخت نے پائی سپہر کی گردش
کِسی کو عقل کِسی کو تمیز ہاتھ آئی
ملا زمیں کو شرف جلوۂ حسیناں سے
غرضکہ بیخ گیا جس قدر خیال اُس دن
مگر نصیب سے بیخودی رہ گیا محروم

کِسی کے قلب کو آزارِ التہاب مِلا
کِسی کو شوقِ قدح نوشیِ شراب مِلا
کِسی کو بیخودِ شوریدہ سر خطاب مِلا
کِسی کے دِل کو زمانے کا انقلاب مِلا
کِسی کو ذہن ہزاروں میں انتخاب مِلا
فلک کو بحرِ ضیا نورِ آفتاب مِلا
ہر ایک اپنی مرادوں پہ کامیاب مِلا
نہ کچھ عذاب ہی پایا نہ کچھ ثواب مِلا

پھر اب کہو کہ "دیا کیا" کِسی نے کچھ نہ دیا
پھر اب کہو کہ "ملا کیا" فقط جواب مِلا

(۷۲) اِحسان ۱۳ ۱۹ء

احسان منشی احسان علی خاں خلف منشی قاسم علی خاں آپ شاہجہانپور کے باشندے تھے ۱۲ ھ مطابق ۱۸۵ء میں ولادت ہوئی۔ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگردِ رشید سے تھے۔ شاہجہانپور میں مختاری کا پیشہ کرتے تھے۔ آپ ہی ایک ادبی ماہوار رسالہ "اُرمغان" کے نام سے جاری کیا تھا جو عرصے تک جاری رہا۔ جولائی ۱۳ ۱۹ء مطابق ۱۳۳ھ میں

وفات پائی۔ دیوان اور رسالہ "شبیہہ یار" آپ کی یادگار ہیں۔

کلام یہ ہے۔

(۱۴۸) غزل

اس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اُٹھائیے سر تسلیم خم ہوا

توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا
وہ بھی انھیں کا قول نہ انھیں کی قسم ہوا

اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش
نقش قدم یار کا نقش قدم ہوا

کیسا مری وفا نے پشیماں کر دیا
آنکھیں بھی اُن کی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا

دونوں طرف ہے جب ہی دل ایک جان ایک
مجھ پہ ستم ہوا تو تمھیں پر ستم ہوا

محروم عیش میری طرح دوسرا کہاں
دل میں سرور وصل بھی آیا تو غم ہوا

احسان ضبط کرنے سے اخفائے راز عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

(۷۳) حالی سنہ ۱۴ ۱۹ء

حالی شمس العلما خواجہ الطاف حسین خلف خواجہ ایزد بخش انصاری مولد پانی پت سنہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی آ گئے تھے۔ ابتداءً حضرت شیفتہ سے کلام میں

اِصلاح لیتے تھے۔ بعدہٗ اُردو فارسی دونوں کلام مرزا غالبؔ کو دکھانے لگے اور آپ کے ارشد تلامذہ میں داخل ہوئے چالیس پینتالیس سال کی عمر تک قدیم طرز میں غزل کہتے رہے ۱۸۷۰ء میں جب کہ سرسید احمد خاں مرحوم مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیئے ایک نئی روح پھونک رہے تھے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ قایم ہوئے صرف ۱۲ سال گزرے تھے۔ حالی پر سرسید کی نظر پڑی اور وہ یہ کہہ اُٹھے:۔

اں دل کہ رم نمودے از خوبروجواناں

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

اُسی زمانہ میں اُنھوں نے سرسید کی تحریک سے مسدس "مد و جزر اسلام" لکھا جس میں مسلمانوں کو اُن کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا نقشہ اس طرح دکھایا کہ سخت سے سخت دلمیں تاثیر کی ایک بجلی دوڑ گئی۔ اُس مسدس کے شایع ہونے سے نہ صرف مسلمانوں میں ترقی کے جذبات پیدا ہوئے بلکہ اُردو نظم کی تاریخ میں قومی شاعری کی داغ بیل پڑ گئی۔ اس سے قبل اس قسم کی نظم اُردو میں موجود نہ تھی۔ اور نہ اس وقت تک اس پایہ کی کوئی دلگداز قومی نظم اُردو میں پائی جاتی ہے یہ وہی مسدس ہے جس کی نسبت سرسید نے مولانا حالی کو اپنے خط مورخہ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء میں لکھا تھا بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں جب خدا پوچھے گا کہ "تو کیا لایا؟" میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں، یہ مسدس مختلف مطابع میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے ایک نفیس پاکٹ ایڈیشن ۱۹۰۹ء میں نامی پریس کانپور نے چھاپا تھا۔ اس سے قبل اسی مطبع نے

ویسا ہی ایڈیشن رباعیات حالی کا بھی شایع کیا تھا جس کی ملک نے بہت
نثرنگاری میں بھی کم نہ تھا۔ حیات جاوید۔ یادگار غالب وغیرہ اس کی شاہد ہیں۔ دیوان
مبسوط مقدمہ کے ۱۸۹۳ء میں نامی پریس میں طبع ہوا ہے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء مطابق
کو خواجہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔

انتخاب مدوجزر اسلام

(۱۶۹) بعثت ختم المرسلین

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔۔۔ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ۔۔۔ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطاکار سے درگزر کرنے والا ۔۔۔ بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا ۔۔۔ قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا ۔۔۔ کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا ۔۔۔ پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

کان میں دھات تھی اک نکمی
نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اُس کی جوہر تھے اصلی
ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی
یہ تھا ثبت علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر
تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب!
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب"

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہی کہ لوٹے تمہیں گھات پاکر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہی
کہ بچپن سے صادق ہی تو امیں ہی"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہی
تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہی
کہ سب قافلہ یاں سے ہی جانے والا

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"

وہ بجلی کا کڑکا تھا۔ یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

(۱۷۰) خلافت اندلس

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

(۱۷۱) خلافت بغداد

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس پہ عباسیوں کا نشاں تھا
عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا
اڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو

سنے گوشِ عبرت سے جا جا کے انساں
کہ تھا جن دنوں مہرِ اسلام تاباں
تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
ہوا یاں کی تھی زندگی بخشِ دوراں
پڑی خاکِ ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا تازہ پھر نامِ یوناں یہیں سے

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانوں
وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بو اُن کی پھوٹی

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن
نوشتوں سے ہے جن کے اب تک مزین
پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
کتب خانہ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

(۱۷۲) ملتِ اسلامیہ و دیگر اقوام و ملل

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا
چڑھے اس پہ پھر اک خردمندِ دانا
کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا
تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ

کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں
بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں
بہت اُن سے کمتر پہ ہیں سبز و خنداں
بہت خشک اور بے طراوت مگر ہاں

نہیں لگ رہے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سراسر
جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں
جہاں گر کے دیتا ہے رو ابرِ نیساں
تردد سے جو اور رہتا ہے ویراں
نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آوازِ پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغِ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا
نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا
نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کیے پَے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

(۱۷۳) اُمید سے خطاب!

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بجھا تو
ذرا نا اُمیدوں کی ڈھارس بندھا تو
جھلک اے اُمید اپنی آخر دکھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

سفینہ پئے نوح طوفاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار ہجراں میں تو تھی
سکوں بخشِ یعقوبؑ کنعاں میں تو تھی
دل آرامِ یوسف کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمّت ہے پیر و جواں کی
تجھی پر ہے بُنیادِ نظمِ جہاں کی
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خوشدلاں کی
نہ ہو تو۔ تو رونق نہ ہو۔ اِس مکاں کی

تگاپو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَوا رَوی ہے ہر قافلے میں تجھی سے

کسانوں سے کٹر ہیں تو ہی بُواتی　　جہازوں کو گرداب میں ہے کھواتی
سکندر کو دارا پہ ہے تو چڑھاتی　　فریدوں کو ضحاک سے ہے لڑاتی

چلے سب جدھر تو نے مائل عناں کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے　　تونگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دست رس نارساؤں کو تو نے　　کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے

سکندر کو شانِ کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دُنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں　　خور و زاد سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں　　نہ محرم کوئی جو سُنے دردِ پنہاں

ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانہ ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا　　سہیں کا گماں تک نہیں جب کہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا　　مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا

اگر موجزن اُس کے دل میں نہ تو ہو
تو دُنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر　　بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر

پہاڑ اک فزوں اور ہو کوہِ غم پر
گزرنی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پر

نہیں فکر تو دل بڑھاتی ہو جب تک
دماغوں میں بو تیری آتی ہو جب تک

یہ سچ ہو کہ حالت ہماری زبوں ہو
عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہو

جہالت وہی قوم کی رہنموں ہو
تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہو

مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

(۱۷۴) قطعہ

ہوئی ویران جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

اپنی رُوداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

اب نہ اُلفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ
سر ہے سودا سے تہی، عشق سے دل ہے خالی

گر غزل لکھیئے تو کیا لکھیئے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی

آپ بیتی نہ ہو جس میں وہ کہانی بےلطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

ہاں مگر کیجیئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچیئے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی

تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہ کہیں ہو نہ ہماری وہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

(۱۷۵)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز — دوستو! دل نہ لگانا۔ نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی — دیکھنا! شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی — زد میں تیر صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلوت یکہ وہ ہی بُرقع میں نہاں — کسی دلّالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے — تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق — آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدرشناس — قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سُنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب! — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم — دیکھنا! ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح — دیکھ! اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں اک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانا ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

(۱۷۶) قصیدہ عرض حال بجناب سرور کائنات صلعم

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسرے — خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں — اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں — اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا — اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی — اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی — وہ عرصۂ تیغِ جہلا و سفہا ہے

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب — اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی — دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی — منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز — یہ مجلسِ اعیاں ہے وہ بزمِ شرفا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں — پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے ۔۔۔ اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

ہے دین کی دولت سے بہا علم سے رونق ۔۔۔ بے دولت و علم اس میں نہ رونق نہ بہا ہے

شاہد ہے اگر دین تو علم اس کا ہے زیور ۔۔۔ زیور ہے اگر علم تو مال اس کی جلا ہے

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت ۔۔۔ اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی ۔۔۔ پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر ۔۔۔ مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبدِ اقبال ۔۔۔ ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہے

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار ۔۔۔ جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہے

وہ روشنیِ بام و درِ کشورِ اسلام ۔۔۔ یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج ۔۔۔ بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو ۔۔۔ اس قوم کا اک ایک گھر اب بزمِ عزا ہے

چاؤش تھے للکارتے جن رہ گزروں میں ۔۔۔ دن رات بلند ان میں فقیروں کی صدا ہے

وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی ۔۔۔ وہ یاد میں اسلاف کی اب رو بہ قفا ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی ۔۔۔ اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

کھوج ان کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا ۔۔۔ گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی ۔۔۔ ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکم قضا ہے

تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا کے ۔۔۔ اب خوف ہے مدت سے دلوں میں نہ رجا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت   شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہے
دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت   سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے
کی ریت بدن سب نے ہے پوشاک کتاں کی   اور برف میں ڈوبی ہوئی کشور کی ہوا ہے
درکار ہے یاں معرکے میں جوشن و خفتاں   اور دوش پہ یاروں کے وہی کہنہ ردا ہے
دریائے پر آشوب ہے اک راہ میں حائل   اور بیٹھ کے گھڑناؤ پہ یاں قصدِ شنا ہے
ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت   واں قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہے
یہاں نکلے ہیں سودے کو درم لے کے پرانے   اور سکہ رواں شہر میں مدت سے نیا ہے
فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہباں   بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی   دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا   جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
صدمہ درِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا   کی ان کے لئے تو نے بھلائی کی دعا ہے
کی تو نے خطا عفو ہے ان کینہ کشوں کی   کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم   ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے
جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری   منقول انہیں سے تری پھر مدح و ثنا ہے
برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا سے ہیں اپنے   اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے
کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں   خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن   دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہی

ہر چپقلش دہر مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہی پیروں کا عصا ہی

جو خاک ترے در پہ ہی جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لیئے داروئے شفا ہی

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرّف
اَب تک وہی قبلہ تری اُمّت کا رہا ہی

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہی

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ ایک ایک فدا ہی

گر بد ہیں تو حق اپنا ہی کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالح لی ہم نے سُنا ہی

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہی اگر حال بُرا ہی

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خدا ہی

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہی

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
اُمّت تری ہر حال میں راضی برضا ہی

عزّت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہی

ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حد ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہی

ہی یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہی کون مخاطب
یہاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہی

(۷۴) اوج ۱۹۱۷ء

اوج۔ میرزا محمد جعفر خلف الرشید حضرت دبیر۔ عربی۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی۔ علم عروض میں کمال تھا اس فن میں آپ نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا۔ جو اردو کی دنیا میں نہایت مقبول ہوا جعفری بیگم صاحبہ کے اوقاف سے اُن کو مرثیہ خوانی کے صلے میں ایکہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ بعض تعلقہ داران اودھ بھی قدردانی فرماتے تھے۔ آپ اپنے باپ کے قابلِ فخر یادگار تھے۔ سلام۔ مرثیہ۔ رُباعی سب کچھ کہتے تھے۔ مگر تمام اصناف سخن میں آپکے سلام مطبوع خلائق ہوئے ستر برس کی عمر پائی ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ میں انتقال کیا

کلام کا انتخاب ہے

(۱۷۷) سلام

خواہشیں دنیا کی بارِ دوش و گردن ہو گئیں
رفتہ رفتہ منزلِ عقبیٰ کی رہزن ہو گئیں

یہ ہوا کیسی چلی اِس تنگنائے دہر میں
شہر جنگل ہو گئے۔ آبادیاں بن ہو گئیں

چل سوئے گورِ غریباں اے حریصِ مال و زر
دیکھ کتنی آرزوئیں نذرِ مدفن ہو گئیں

کیسی رنگا رنگ شکلیں ہو نگی اے عرُوسِ بہار
مٹ کے جو گلگونۂ رُخسارِ گلشن ہو گئیں

کھُل نہیں سکتی کبھی کیفیت بغض و حسد
میری آہیں پردۂ ناموسِ دُشمن ہو گئیں

میرے نغموں نے جو پائی قلبِ گلشن میں جگہ
شاخِ گل پر بلبلیں بارِ نشیمن ہو گئیں

جب مرے نالے ہوئے قدِ صنوبر سے بلند
بلبلیں ساکت سرِ دیوارِ گلشن ہو گئیں

جامۂ ہستی ہوا اسعدؔ چاک جب مثلِ سحر
زینتیں دُنیا کی گرد اگردِ دامن ہو گئیں

ہو سکے عون و محمد سے نہ سر بر زرہ پوش
حق میں بیٹوں کے دُعائیں ماں کی جوشن ہو گئیں

(۷۵) اسمٰعیل ۱۳۳۶ء ۱۹۱۷ء

اسمٰعیل مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھ کے رہنے والے تھے ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں مدرس فارسی تھے۔ جدید طرز کی نظم لکھنے والے شعرا میں

ممتاز تھے۔ اُردو کے ساتھ فارسی بھی کہتے تھے اُردو مدارس کے ابتدائی درجوں میں اُن کی مصنفہ کتابیں عرصے تک رائج رہیں۔ گورنمنٹ نے اُن کو "خان صاحب" کا خطاب دیا تھا۔ زبان کی سلاست، مضامین کی سادگی سے کلام کو ایسی مقبولیت ہوئی ہے کہ بچوں کو اُن کے اشعار نوکِ زبان ہو جاتے ہیں۔ کلیاتِ اسمٰعیل نہایت اہتمام سے ۱۹۰۱ء میں چھپ چکی ہے۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ کو انتقال ہو گیا۔

کلام کا انتخاب یہ ہے

غزل (۱۷۸)

جو بھلے برے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا — نہ جزائے خیر پاتا نہ گناہ گار ہوتا
مئے بے خودی کا ساقی! مجھے ایک جرعہ بس تھا — نہ کبھی نشہ اُترتا نہ کبھی خمار ہوتا
میں کبھی کا مر بھی رہتا نہ غمِ فراق سہتا — اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا
یہ جو عشقِ جاں ستاں ہے یہ وہ بحرِ بے کراں ہے — نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا تمھیں ناگوار ہوتا
ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا — کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

(۱۷۹)

مانعِ سرگشتگی وہ سنگِ در ہوتا نہیں — پھوڑنا سر کا علاجِ دردِ سر ہوتا نہیں

حیفِ دنیا! ہائے عقبیٰ! منزلِ دلبر ہے دور
دل جو ہنستے ہیں کھٹکا ہے سفر ہوتا نہیں

یاد اور امید کی دولت سے کٹ جاتے ہیں دن
ورنہ غم کھانے سے دنیا میں گزر ہوتا نہیں

دعوئ الفت ہے کچا جو نہ ہو دل میں تپش
بے حرارت تو کبھی پختہ ثمر ہوتا نہیں

خوف جاتا ہے نامہ بر جانے کی ہامی کیوں بھرے
رشک سے یاں اعتبارِ نامہ بر ہوتا نہیں

صدمۂ دل کو بوقتِ امتحانِ عشق ہے
بے پسے سرمہ بھی منظورِ نظر ہوتا نہیں

ہے شعور اس کا بھی اک حجابِ آگہی
بے خبر جب تک نہ ہولے باخبر ہوتا نہیں

(۱۸۰) اچھے دنوں کی یاد

ایامِ وصال بھی تھے کیا دن
راتیں تھیں مرادِ مدعا دن

محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات
معلوم نہ تھا کدھر گیا دن

کیا جلد گزر گئے وہ دن حیف!
ہوتا کوئی اور بھی سوا دن

تھی رات بہت دنوں سے اچھی
راتوں سے زیادہ خوب تھا دن

تھی بزمِ وصال دن ہو یا رات
تھی دیدِ جمال شب ہو یا دن

دنیا میں بزرگ تھی وہی رات
تھا عمر میں بس وہی بڑا دن

ہر صبح عجیب بشامِ نادر
ہر رات جدید۔ اور نیا دن

تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات
تھی شب کو مسرت اب ہوا دن

عالم کو زبس کہ ہے تغیّر تھا خواب و خیال وہ زمانہ		رہتے نہیں ایک سے سدا دن بجلی ہوئی رات اور ہوا دن

دن رات یہی فغاں ہے لب پر
وہ رات رہی نہ وہ رہا دن



حصّۂ دوم

شعرائے حال کے کلام کا انتخاب

اِس حصّہ میں اُن شعرا کو لیا گیا ہی جو بوقت ترتیب تذکرہ یعنی جولائی ۱۹۲۱ء تک زندہ تھے اُن کو بہ لحاظ تاریخ ولادت درج کیا گیا ہی لیکن نمبر سلسلہ دونوں حصوں کا ایک ہی رکھا گیا ہی

(۷۶) اکبر ۱۸۴۶ء

اکبر۔ خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب رضوی۔ دورِ موجودہ کے مشہور شاعر ہیں ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۴ھ کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ رضا تک پہونچتا ہی شاعری کے پردہ میں درستیِ اخلاق خاص ان کا حصّہ ہی۔ کلام میں جدّت بیشتر ہی لیکن ظرافت کو صحت زبان پر مقدم رکھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ان کے کلام سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ انگریزی الفاظ

اردو میں کھپانے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ جدید محاورات جو انگریزی اختلاط سے اردو میں پیدا ہوتے جاتے ہیں ان کے یہاں اشعار میں اکثر بندھے ہوئے ملیں گے۔ حضرت وحید الٰہ آبادی شاگرد آتش سے تلمذ ہی دو دیوان شایع ہو چکے ہیں جو کلیات اکبر کے نام سے مطبوع خاص و عام ہیں صوبۂ متحدہ میں جج رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں پنشن پائی ۱۸۹۸ء میں خان بہادری کا خطاب ملا۔ نمونۂ کلام یہ ہی:-

(۱۸۱) غزل

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہونگے ۔ نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی ۔ نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی ۔ نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے ۔ نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے
نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں ۔ نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیبِ رقم ہونگے
خبر دیتی ہے تبدیلِ ہوا تحریکِ موسم کی ۔ کھلیں گے اور ہی گل، زمزمے بلبل کے کم ہونگے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت کی ۔ نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہونگے
بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے ۔ مگر بے جوڑ ہونگے اس لئے بے تال و سم ہونگے

(۱) اس تذکرہ کی تالیف کے وقت خان بہادر صاحب بقیدِ حیات تھے لیکن مطبع میں مسودہ بھیجے جانے کے بعد ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال ہوگیا۔

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی بھول جائیں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا، نہ غم ہوگا

لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں سب سے کم ہونگے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

(۷۷) شاد ۱۸۴۶ء

سید علی محمد نام ہے۔ ساداتِ عظام سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۲ واسطوں سے حضرت سیدنا امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ سید حسین فیروزی بادشاہِ عراق و فارس جن کا ذکر خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے اس شعر میں کیا ہے آپ کے اجداد میں تھے ؎

راستی خاتمِ فیروزہ بو اسحاقی
خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

۱۹ محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے فارسی عربی میں کامل استعداد ہے (پنگل) (عروض ہندی) سے بھی واقفیت ہے۔ اپنے تصنیف کردہ اشعار کی تعداد مولانا نے خود ایک لاکھ سے چند ہزار زائد لکھی ہے۔ آپ کی تصانیف ... ہیں

تاریخ صوبہ بہار" "مردم دیدہ" وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے حال میں ایک نئی کتاب "حکمِ بلیغ" لکھی ہے جس میں اُردو کے تاریخی حالات میر انیسؔ ۔ دبیرؔ ۔ ضمیرؔ ۔ خلیقؔ وغیرہ مشہور مرثیہ گو شعرا کے سوانح ان کے کلام کا انتخاب اور اس پر تنقید ہے۔ اس کی اشاعت سے اُردو ادب میں مفید اضافہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام دیوان کی صورت میں اب تک شایع نہیں ہوا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں گورنمنٹ سے خان بہادری کا خطاب پایا اور ۱۸۹۳ء میں پبلک نے ادبی خدمات کا اعتراف کر کے سید الشعرا کے لقب سے ممتاز کیا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے

(۱۸۲) غزل

ہم سے نہ حق ادا ہوا عشق کرشمہ ساز کا
شکوہ کریں تو کیا کریں جانِ بہانہ باز کا

ہجر میں اے دلِ حزیں جو ہو خبر وہ ہو
لب کبھی ہلانا منع ہے مجھ سے امینِ راز کا

ہو گی جب اپنی آنکھ بند آئیگا وہ کھلا کبھی
دیکھ سکا نہ جو سماں دیدۂ نیم باز کا

بوسۂ سنگِ آستاں مل نہ سکا ہزار حیف
آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمتِ سرفراز کا

اے دلِ مضطر آٹھ وقتِ سوال کبھی تو ہو
مجھ کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا

جلوہ حسن کی طرف دیکھ تو کچھ پتا چلے
جانے دے ولولہ نہ پوچھ عاشقِ پاکباز کا

کشتۂ چشم ہو گیا کھول کے آنکھ اسی طرح
ذکر کسی نے کیوں کیا اُن کی نگاہِ ناز کا

پار لگائے گا وہی اپنی شکستہ ناؤ کبھی
دل کو بنایا ناخدا جس نے مرے جہاز کا

ان کے پیام کا جواب کس نے کہا کہ نالہ نے — کوئی علاج کیا کرے ایسے زباں دراز کا

قصۂ ہجر تا کجا تھک بھی چکے مری زباں — ہو بھی تو خاتمہ کہیں اس گلۂ دراز کا

پیرِ مغاں کے معجزے دیکھ چکے ہو واعظو — تم نہ پیو جو مے تو خیر حکم تو دو جواز کا

خاک بہت سی چھان کر دشت و جبل سے ہم پھر آئے — شاد پتا ملا نہ آہ قافلۂ حجاز کا

(۱۸۳)

آئی خزاں بہار کا موسم نکل گیا — کیوں اے نسیم تیرا کلیجہ نہ ہل گیا

اس باغ میں بہار خزاں کچھ نئی نہیں — دِل کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

قاصد مریضِ عشق سدھارا جہان سے — اب کے پیام وصل کا جادو نہ چل گیا

(۱۸۴)

ہی کس نے ہے کون تیری سہے گا — نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا

ترا نام کیوں غیر لے میرے آگے — مرا دل بھی دل ہے کچھ آخر کہے گا

زمانے سے ہم تو گزر جائیں گے خود — زمانہ مگر آپ کو کیا کہے گا

یہ دنیا ہے اے شاد ناحق نہ الجھو — ہر اک کچھ نوا ہی سی آخر کہے گا

(۱۸۵)

غفلت میں ہوئے اوقات بسر اے عمر گریزاں کچھ نہ کیا
کی فکرِ وصالِ یار بہت لیکن سر و ساماں کچھ نہ کیا

جنبش سے تری مقتل ہوتا اک آن میں دشتِ کرب و بلا
عشاق کی بیباکی کے عوض اے ابروئے براں کچھ نہ کیا

اُلٹا نہ عراق و شام و حلب دنیا نہ ہوئی ویران تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا تو خونِ مسلماں کچھ نہ کیا

اے ننگ جہاں اے شادؔ بتا کچھ آئی تجھ کو شرم و حیا
اے جہلِ مرکب اے حیواں اے بے خبر انساں کچھ نہ کیا

(۱۸۶)

وہ کیسی نعمت تھی اے محبت کہ جس نے ہر شخص کو مٹایا
نہ نیست ہونے کا جی میں کھٹکا نہ ہست کا لطف کوئی پایا

نظر میں ویراں ہے بزمِ عالم بغیر دل کے یہ ہم نے پایا
جو دل پہ الزام ہے گیا کیوں ہمیں نے خود دیکھے کیا بنایا

اُمید اور نہ بھی کس کی ہو دل و ملال ہی شی کی آفت کچھ کہہ
ہمیشہ دھوکے پہ کھائے دھوکے ہمیشہ دہ کے آزمایا

کہاں یہ ریشِ سفید اپنی کہاں جوانوں کی بزم ساقی
بُرا ہوا اس شوق کا الٰہی ہمیں بھی کافر لگا کے لایا

اُنہیں جو منظور دیکھنا ہو تو آ کے سینے میں دیکھ جائیں
لیا سنبھالا مریضِ غم نے چراغ رہ رہ کے جھلملایا

بتاؤ للّٰلہ منصفی سے یہ تذکرہ کر رہا ہوں دل کا
یہی وفا تھی یہی مروت کہ پھر کے شامت زدہ نہ آیا

(۱۸۷)

ادھر بھی کاش اک دن وہ سراپا ناز نکلے
کبھی ہم سے غریبوں کے بھی دل کا حوصلہ نکلے

کہاں تاب و تواں اک عمر کا ہجراں کشیدہ ہوں
بہ آسانی دم اپنا اپنے تن سے اے خدا نکلے

عدم میں آ کے بھی خوف و رجا ہمراہ ہیں اپنے
ہنوز آلودہ ہیں نکلے بھی دنیا سے تو کیا نکلے

در و دیوار کی اُلفت نے بیخود کر دیا سب کو
ترے مہماں بہ مشکل تجھ سے اے مہماں سرا نکلے

غائبانہ تک کی بہی خواہی ہے مقصودِ باطن میں
بظاہر ہو زباں پر بد دعا دل سے دعا نکلے

چھری چلتی ہے یا رب انتظارِ قتل میں گردن پر
گھٹا جاتا ہے دم کب دیکھیے تیغِ قضا نکلے

وہ آنکھیں ہیں کہاں جن سے کھلے سب راز عالم کا
تماشا دیکھنے بیکار اس میلے کا آ نکلے

پلٹ کر پھر نہ پوچھا شاد جیتا ہے کہ مرتا ہے
وفادار و عالم میں جا کے تم بھی بے وفا نکلے

(۷۸) اثر ۱۸۴۹ء

اثر شمس العلمار جناب مولوی نواب سید امداد امام صاحب بہادر، رئیس اعظم پٹنہ، ارگہت ۱۸۴۹ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ خاندان سادات کرام سے ہیں۔ علوم مشرقی و مغربی میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں بالخصوص فن طبابت میں بہت زیادہ توغل ہے ۵۴ برس سے خلق خدا کی طبی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کا خاص رنگ ہے فطرتی جذبات محققانہ مسائل عاشقانہ واردات کو تغزل کے رنگ میں نبھانا آپ ہی کا حصہ ہے اس کے ساتھ ہی بلند پروازی کو جو غزل سرائی کی جان ہے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے آپ کا دیوان چھپ چکا ہے شاعری کے فن میں آپ نے ایک کتاب "کاشف الحقائق" لکھی ہے جس میں مشہور شعرائے اردو کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

(۱۸۸) غزل

یہی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن رہے گی جب تک کہ جاں رہے گی
یقیں ہے اس کا کہ بعد مردن لحد بھی اپنی تپاں رہے گی

بہارِ عیش و نشاط کیسی، شگفتہ کیوں ہوں گُلِ تمنّا
ترے گلستاں میں بلبلِ دل خزاں رہی ہے خزاں رہے گی

شباب شاعر ہے عہدِ پیری کلام کا زور کم نہ ہوگا
رہے گی جب تک کہ جاں بدن میں طبیعت اپنی رواں رہے گی

وہ نعمتیں ہیں تری خدایا کہ وجد ہوتا ہے جن سے دل کو
رہے گی فرطِ ادب سے رقصاں دہن میں جب تک نہ بات رہے گی

چھپاؤں میں لاکھ سوزِ غم کو فغاں کا شعلہ بھڑک اُٹھے گا
دل و جگر جب اثر جلیں گے یہ آگ کیونکر نہاں رہے گی

(۱۸۹)

جفا پرور سے اُمیدِ وفا کیا		عدو کے جور کا تجھ سے گلا کیا
غرض دلدادگی کی جانتے ہیں		کروں میں اُن سے عرضِ مدعا کیا
نہیں جب جوہرِ مردم شناسی		ستائش ہائے دشمن کا گلا کیا
سپاسِ طالعِ نسبت کو چہ معنی		شکایت ہائے بختِ نارسا کیا
عدو سُنکر نہ چومے دستِ قاتل		دہانِ زخم شورِ مرحبا کیا
سراپا جلوۂ رنگِ وفا ہے		دلِ خوں گشتہ کے آگے حنا کیا
صبا آوارہ و گل نذرِ صرصر	قطعہ	چمن کی ہو گئی اگلی ہوا کیا
فروغِ جلوۂ گل عارضی ہے		تماشائے بہارِ بے بقا کیا
عبث کرتی ہے بلبل ماتمِ گل		غمِ بربادیِ اہلِ فنا کیا
اثر موہوم ہے مضمونِ ہستی		نہیں معلوم ہے کیا اور بقا کیا

(۱۹۰)

جفائیں ہوتی ہیں گھٹتا ہے دم ایسا بھی ہوتا ہے
مگر مجھ پر جو ہے تیرا ستم ایسا بھی ہوتا ہے
عدو کے آتے ہی رونق سدھاری تیری محفل کی
معاذاللہ انساں کا قدم ایسا بھی ہوتا ہے
رکاوٹ ہی خلش ہے چھیڑ ہے ایذا پہ ایذا ہے
ستم اہلِ وفا پر دم بدم ایسا بھی ہوتا ہے
حسینوں کی جفائیں بھی تلون سے نہیں خالی
ستم کے بعد کرتے ہیں کرم ایسا بھی ہوتا ہے
نہ کر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
نہ ہو دردِ جدائی سے جو واقف اس کو کیا کہیئے
ہمیں وہ دیکھ کر کہتے ہیں غم ایسا بھی ہوتا ہے
بتوں کے ملنے جلنے پر نہ جانا اے دلِ ناداں
بڑھا کر ربط کر دیتے ہیں کم ایسا بھی ہوتا ہے
ہمیں بزمِ عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے
کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

ہوا کرتا ہی سب کچھ ای اثرؔ اُس کی خدائی میں
کریں دعوے خدائی کا صنم ایسا بھی ہوتا ہی

(۱۹۱)

ای نو رسیدگانِ جوانی ذرا سنو!
ملتا تھا لطفِ زیست ہمیں بھی شباب میں

اک دن وہ تھا کہ ساقیِ مہوش تھا اپنے پاس
پیتے تھے ہم شرابِ شبِ ماہتاب میں

وہ بُت کہ دل کو حلقۂ دامِ بلا میں لائیں
زلفیں تھیں جن کی تا بہ کمر پیچ و تاب میں

آنکھوں کے سامنے سے الٰہی کدھر گئے
اب تو نظر بھی آتے نہیں ہم کو خواب میں

احبابِ ہم جتنے تھے سب ہو گئے ہوا
گویا شراب پیتے تھے جامِ حباب میں

ہر لحظہ اُن کی یاد میں روئیں نہ کیوں اثرؔ
تصویریں اُن کی پھرتی ہیں چشمِ پُر آب میں

(۱۹۲)

سُنا حال دل پر کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سنا کچھ نہیں

مقدّر میں جو تھا وہ تم نے کیا
بتو تم سے ہم کو گلہ کچھ نہیں

شبِ ہجر ہوتا چلا میں فنا
سحر ہوتے ہوتے رہا کچھ نہیں

نہ گل پر ہے جوبن نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی بامیدِ حور
مگر تجھ کو زاہد حیا کچھ نہیں

خدا اُن سے بندوں کو اپنے بچائے
کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں

حسینوں کے انداز مت پوچھیے
جفا ہی جفا ہے وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

(۱۹۳)

اپنی نظروں میں کھپے خود رخِ زیبا ہو کر
آپ کو دیکھتے ہیں آپ تماشا ہو کر

دیکھ ثابت قدمی اہلِ وفا کی اپنے
تیرے کوچہ میں ہے نقشِ کفِ پا ہو کر

اپنے مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ بھی
قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلیٰ ہو کر

کیا ترا ساتھ ازل میں نہ ہوا تھا مجھ کو
میں نہ پہچانوں تجھے تیرا آشنا سا ہو کر

دشت میں ڈھونڈھنے جب قیس کو لیلیٰ نکلی
رہنما شوق ہوا جادۂ صحرا ہو کر

ایک جانب سے محبت نہیں باقی انجام
میں ترا ہو گئے ہوں تو ہے میرا ہو کر

طور ہی طور ہے صحرائے طلب میں اپنے
ذرہ ذرہ ارنی کہتا ہے موسیٰ ہو کر

خضر و موسیٰ کی حکایت سے عیاں ہوتا ہے
جلوہ فرمائیاں کیں آپ نے کیا کیا ہو کر

آج کیوں صحبتِ احباب پہ مرتا ہے اثر
زیرِ مدفن تجھے کل رہنا ہے تنہا ہو کر

(۷۹) حافظ ۱۸۵۲ء

حافظ۔ قاضی خلیل الدین حسن ولد قاضی بشیر الدین احمد صدیقی عبدالرحمانی پیلی بھیت کے شرفا میں ہیں اور وہیں وکالت کرتے ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں۔ حافظ قرآن ہیں۔ دو مرتبہ حج کعبہ و زیارت روضۂ منورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے نعت گو شعرا میں آپ کا کلام بہت مشہور ہے۔ اپنے ماموں قاضی ممتاز حسین صاحب ممتاز کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر گوئی کا بھی ملکہ ہے۔ علم عروض و معانی و بیان پر عبور ہے نہایت ستھرا صاف اور پاکیزہ شعر کہتے ہیں۔ کلام کی تنقید اور شعر کے حسن و قبح سمجھنے میں خداداد ملکہ ہے۔ وضعدار خوش اخلاق ہیں ۶۹ سال کی عمر ہے پانچ دیوان نعتیہ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ چھٹا مرتب ہے۔ عاشقانہ شاعری چالیس برس سے ترک کر دی ہے۔ آپ کی تاریخ پیدایش ۲۲ جون ۱۸۵۲ء مطابق ۵ رمضان ۱۲۶۸ھ ہے۔[ل] نمونہ کلام یہ ہے:۔

(۱۹۴) رباعیات

دنیا تری قدرت کی تماشائی ہے
جلوہ ہے دوئی میں بھی تری وحدت کا
چھائی ہوئی سب پہ تری یکتائی ہے
دو آنکھیں ہیں اور ایک بینائی ہے

ل افسوس کہ ۶ رجب ۱۳۴۸ھ م ۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو انتقال ہوگیا۔

(۱۹۵)

دنیا سے ضرور کوچ کرنا اک روز	ہے سر جادۂ ہستی سے گزرنا اک روز
جینے سے زیادہ فکر مرنے کی کرو	جینا ہے تمام عمر مرنا اک روز

(۱۹۶)

گوہر کو کرے جمع یہ جوہر ہے تو کیا	جب نفس غنی نہیں تونگر ہے تو کیا
جب جود نہیں، کرم نہیں، فیض نہیں	مٹھی میں جو غنچے کی طرح زر ہے تو کیا

(۱۹۷) غزل

دل کو حسرت آئی تھی کوتاہی تقدیر پر	جنبش مژگاں سے چل کر تیر پہونچے تیر پر
دانہ دانہ کر کے جب قسمت نے کی تقسیم رزق	نام دیوانوں کا لکھا دانہ زنجیر پر
دل کے پردے میں وہ صورت ہے کہ چھپ سکتی نہیں	ایک آئینہ لگا ہے صاف اس تصویر پر
روتے روتے بندھ گئی ہچکی دم عرض سوال	اور پھندا پڑ گیا الجھی ہوئی تقریر پر
جب کوئی آئی مصیبت آئی دل کو تاکتی	جب کبھی ٹوٹی خرابی ٹوٹی اس تعمیر پر
کل ہم آئے آج رخصت صبر اب کس پر کریں	ہجر کی تعجیل پر یا موت کی تاخیر پر

ہند سے حافظ دوبارہ چل کے آیا ہے حضور
اک نظر ہو اس گدائے بے نوائے پیر پر

(۸۰) شوق ۱۸۵۳ء

شوق: شیخ احمد علی ولد کاظم علی قدوائی قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی کے باشندے ہیں تقریباً ۱۸۵۳ء ان کا سالِ ولادت ہے۔ فن شعر میں حضرت امیر کے شاگرد ہیں۔ سادگی بے تکلفی اعلیٰ جذبات کے سوا اُردو کے محاورے نظم میں خوب کھپاتے ہیں ان کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد ریاست رام پور میں طالب علمی کرتے رہے عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں آزاد نامی اخبار نکالا تھا اُس کے بعد پرتاب گڈھ اور بھوپال میں ملازم رہے فی الحال ریاست رام پور میں ہیں اور دفتر حامد اللغات میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں ڈراما "قاسم و زہرا" مثنوی "ترانۂ شوق" اور چند معنی خیز نظمیں ان کے افکار کا نتیجہ ہیں۔ دیوان ہنوز شایع نہیں ہوا ہے۔[1]

کلام کا انتخاب یہ ہے

(۱۹۸) غزل

روح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصدِ گلہ نہ تھا مگر حشر نے جوشِ شوق سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا دامنِ یار دیکھ کر

[1] افسوس کہ اُس وقت جبکہ اس تذکرہ کے طبع ثانی کی نوبت آئی شوق اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اُنکی تاریخ وفات ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء ہے۔ لیکن شکر ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کا دیوان "فیضانِ شوق" شایع ہو گیا

دیکھ کے ایک بار انھیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھیے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر

آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہوں
آگے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر

وصل ہے گر برائے خدا ہاں یہ شگون چاہیے
صبح کو ہم اٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

کعبے کو جا نہ شوق ابھی نیتِ زندگی بخیر
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اگلی بہار دیکھ کر

(۱۸) منشی سنہ ۱۸۵۳ء

شیخ امیر علی ولد شیخ محمد حسین وطن قدیم اکبرپور ضلع فیض آباد۔ مولد و مسکن لکھنؤ مفتی گنج۔ پیدایش ۱۰ صفر سنہ ۱۲۷۰ھ مطابق سنہ ۱۸۵۳ء نذیر علی تاریخی نام ہے۔ منشی تخلص ہے۔ فارسی و عربی میں اچھی دستگاہ ہے۔ لکھنؤ کے مشہور شعرا کی صحبتیں دیکھی ہیں کسی سے تلمذ نہیں۔ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں کبھی کلام کے جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ عرصہ ہوا آپ کا ایک قصیدہ موسومہ نیرنگِ نگار جس میں زمانے کا نقشہ کھینچا گیا ہے احباب کے اصرار سے چھپا تھا ۴۲ برس سے ترکِ وطن کر دیا ہے۔ سالہا سال تک بمبئی رہے۔ آج کل حیدرآباد مقام ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱۹۹) غزل

ذرا انصاف سے کہیے کہ ہمت کس کی نرگئی
جفاؤں کے مقابل ہیں وفا تنہا اگر نکلی

اُبلنے کی جگہ طوفانِ عہدِ نوح کے آخر
حسابِ غم کیا سب نے اپنا اپنا پاک تالابوں نے
ہزاروں حسرتیں دل میں سے مہمان بن بیٹھیں
تنور بیوہ کے پردے میں میری چشمِ تر نکلی
یہ دیکھو خوبیٔ قسمت کہ باقی میرے سر نکلی
نہ لائی تاب مہمانوں کی جان، دل چھوڑ کے گھر نکلی

(۲۰۰)

کیا حال پوچھتے ہو مجھ آشفتہ رنگ کا
سودائے زلف سر میں ہوا اک شوخ و شنگ کا
پھیری نگاہِ ناز اس اندازِ خاص سے
جس سے پتا بھی چل نہ سکا صلح و جنگ کا
ان ہرزہ گوئیوں سے تو مُنشیٔ بُرے ہو دُود
سمجھے ہوئے ہو کیا یہ زمانہ اُمنگ کا

(۲۰۱)

شراب و ساقی و مطرب سے چھٹ یہ ہو نہیں سکتا
سیہ نامہ مرا کیا ابرِ رحمت دھو نہیں سکتا
شہیدِ عشق ہوں گم گشتۂ وادیِ الفت ہوں
کہو خضر و مسیحا سے کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا
دلِ آشفتہ زلفِ پُرشکن کے پیچ میں آیا
قیامت تک تو پھندے سے نکلنا ہو نہیں سکتا

(۸۲) نظم ۱۸۵۵ء

نظم سید علی حیدر طباطبائی لکھنو کے رہنے والے خاندان سادات سے طباطبائی کی اولاد میں ہیں مختلف مشرقی علوم میں مہارت رکھتے ہیں. فن شعر میں تحقیق کا درجہ حاصل ہی شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں. آپ سب سے پہلے کلکتہ میں واجد علی شاہ کے شہزادوں کو عربی تعلیم دینے کے واسطے مقرر کیے گئے تھے ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کا انتقال ہو جانے پر حیدرآباد دکن چلے آئے یہاں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے نظام کالج کے عربی پروفیسر رہے ہیں۔ حیدر جنگ کا خطاب پایا ہی۔ آپ نے دیوان غالبؔ اردو کی ایک مبسوط شرح لکھی ہی۔ جس میں شاعرانہ نکات اور فن سخن کے متعلق قابلِ قدر معلومات کو جمع کیا ہی۔ غزلیات کے علاوہ حالیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ دیوان کا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے اپنے اردوئے معلی پریس علی گڑھ سے شایع کیا ہی ۳۰ محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء تاریخ پیدایش ہی نمونۂ کلام یہ ہی: (افسوس کہ مرحوم اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔)

(۲۰۲) جوشِ گل

وہ موسم ہی کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں
یہ عالم ہی کہ جیسے رنگ تصویروں میں بھرتے ہیں

ہی خوابیدہ جو سبزہ آئنہ خانے میں شبنم کے
نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گزرتے ہیں

پرِ طوطی پہ ہوتا ہی دُمِ طاؤس کا دھوکا
ہوا سے اُڑکے برگِ گل جو سبزے پر بکھرتے ہیں

ملا ہے سبزۂ نوخیز کو کیا رنگِ نگاری
ہوا لگنے سے جس کی خم دل لالے کے بھرتے ہیں

شگوفہ ریز ہو کر ڈالیاں ہوش کرتی ہیں
کہ میکش جانتے ہیں طاق سے شیشے اترتے ہیں

نزاکت سے ادا سے جھوم کر کہتی ہے شاخِ گل
یونہی اک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کہہ رہی ہے چہرۂ گل کی ادھر دیکھو
یونہی محفل میں ہنس ہنس دیتے ہیں پیمانے جو بھرتے ہیں

چمن کی بڑھ کے شاخیں ابر سے کرتی ہیں گلبازی
گلوں کی آئینہ داری پہ طاؤس کرتے ہیں

گماں ہوتا ہے کی لشکر کشی بادِ بہاری نے
نہ ہوش آتا ہے جاتا ہے جب بادِ گل گزرتے ہیں

دمِ صبحِ بہاری ہے رخِ خورشید نقاب افگن
کسی آئینے پر تارِ نفس جیسے بکھرتے ہیں

وہیں جا کر تھمے گا کاروانِ لالہ و گل بھی
نسیمِ صبح کے جھونکے جہاں جا کر ٹھہرتے ہیں

نہالانِ چمن کر لیں گے قبضہ سارے عالم کا
وہاں سے پھر نہیں ہٹتے جہاں تک پاؤں دھرتے ہیں

زمیں پر جال پھیلایا ہے کوسوں زلفِ سنبل نے
عنادل ان دنوں آتے ہوئے گلشن میں ڈرتے ہیں

جوابِ جشنِ جم ہے گرمیِ ہنگامۂ گلشن
کہ لبا لب کشتیِ مے تخت پریوں کے اترتے ہیں

عنادل مل چلے ہیں خاک میں جو کیا خبر ان کی
کہ شاخیں جھومتی ہیں پھول تربت پہ بکھرتے ہیں

(۲۰۳)

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پر درد ہے فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گردِ حسرت، وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اُس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سے نکلا کلام بن کر، کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر

غضب ہی بحرِ فنا کا دھارا کہ مجھ کو الجھا کے پار اُتارا
نفس نے موجوں کا جال بن کر، سحد نے کامِ نہنگ ہو کر

جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورشں سے تنگ ہو کر

بدل کے دُنیا نے بھیس صدہا سے ڈرایا اُسے لبھایا
کبھی زنِ پیر زال بن کر، کبھی بُتِ شوخ و شنگ ہو کر

اُٹھے تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیئے تھا
کہ رہ گئی میرے دل کی حسرت شہیدِ تیغِ درنگ ہو کر

جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم لیت و لعل ہیں پیدا
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل ہیں ہے دم بخ ودرنگ ہو کر

(۳۰۴) گلاب کا پھول

قطعہ

گلگشتِ باغ میں نظر آیا یہ صبح دم
اک گل فرازِ شاخِ چمن آشکارا ہی

پوچھا یہ میں نے دیکھ کے اس کا فروغِ حُسن
کس نازنین کا تو چراغِ مزار ہی

معلوم ہو رہا ہے گریباں کے چاک سے
شاید کسی کی خاک پہ تو سوگوار ہے

کہنے لگا کرے کوئی ماتم کسی کا کیا
اپنی ہی زیست کا نہیں کچھ اعتبار ہے

میں نے کہا ہمیشہ رہے یہ ترا شباب
کہنے لگا کہ چشم زدن کی بہار ہے

پوچھا یہ میں نے کان میں آتی ہے کیا صدا!
بولا اجل اجل کی جہاں میں پکار ہے

پوچھا برنگِ شعلہ تو لرزاں ہے کس لیے
بولا جگر میں زخم ہے پہلو میں خار ہے

میں نے کہا کہ زخمِ جگر کا ہے کیا سبب
کہنے لگا کہ تیغِ قضا سے فگار ہے

میں نے کہا پھری یہ چھری کس گناہ پر
اس نے کہا مشیتِ پروردگار ہے

پوچھا یہ رو کے میں نے کچھ اس کا نہیں علاج
بولا یہ ہنس کے وہ مجھے کیا اختیار ہے

میں نے کہا کہ حیف تو کہنے لگا کہ حیف
جائے قرار ہے نہ تو پائے فرار ہے

(۸۳) شہیر ۱۸۵۶ء

شہیر سید محمد نوح خلف سید رعایت علی۔ آپ مچھلی شہر ضلع جونپور کے رئیس ہیں فن سخن میں حضرت منیر شکوہ آبادی سے تلمذ ہے فارسی عربی میں مناسب لیاقت ہے۔ وکٹوریہ کالج اور آگرہ کالج میں انگریزی کی تعلیم پائی ہے۔ فرخ آباد کے مشاعروں میں شریک اور مدتوں خواجہ بادشاہ سفیر خلف خواجہ وزیر مرحوم کے ہمنشین رہے اور اُن سے بھی افادہ سخن حاصل کیا ہے

آپ کی تاریخ ولادت ۲۵؍ دسمبر سنہ ۵۶ء مطابق سنہ ۱۲۷۳ھ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

غزل (۲۰۵)

سرسبز پھر مرا شجرِ مدعا ہوا
آئی بہار زخمِ جگر پھر ہرا ہوا

سہرا اُسی کے سر ہے شہادت کا اُن دنوں
تیرا شہیدِ ناز ہے دولھا بنا ہوا

تیرِ نگاہ دل سے جگر تک گزر گیا
آنکھوں نے اُن کی یہ بھی نہ جانا کہ کیا ہوا

اے بُت خدا سے مانگوں میں کیونکر دعائے وصل
پتھر کے نیچے ہاتھ ہے میرا دبا ہوا

شاید عرق فشاں دمِ رفتار ہے وہ شوخ
فتنے کے عطر سے ہے زمانہ بسا ہوا

پہونچا دیا گلی میں تری جوشِ اشک نے
طوفان بہرِ کشتیِ دل ناخدا ہوا

کیا سبز ابرِ اشک سے ہو کشتِ آرزو
جب آج تک نہ سبزۂ مژگاں ہرا ہوا

تعقید اس غزل میں ہوئی کیونکر اے شہیرؔ
دل زلف کی گرہ میں ہے شاید پھنسا ہوا

(۲۰۶)

شبِ بلا داغِ آتشیں سے بھی تیرگی میں کمی نہیں ہے
یہ کیسا اندھیر ہے مرے گھر کہ چاند ہے چاندنی نہیں ہے

جفائے معشوق کا گلہ کیا کہ امتحانِ وفا ہے اس میں
جو ہو محبت کی آزمائش وہ داخلِ دشمنی نہیں ہے

جو دارِ منصور کا فسانہ سُنا تو جی کانپ اُٹھا
کہ دل لگانا ہی جان کھونی یہ کچھ ہنسی دل لگی نہیں ہی
نہ جس سے کچھ مجھ کو نفع راحت۔ نہ غیر کی جان کا ضرر کچھ
وہ دوستی دوستی نہیں ہی۔ وہ دشمنی دشمنی نہیں ہی
بھڑک اٹھے گی یہ آگ اک دن لگائی ہی جو دل و جگر میں
کہ اندر اندر سُلگ رہی ہی۔ دبی ہوئی ہی جلی نہیں ہی
یہی ہی دل سوزِ سوزِ فرقت۔ یہی ہی ہمدردِ دردِ ہجراں
رہے سلامت اجل ہماری۔ ہمیں غمِ بے کسی نہیں ہی

نہیں رہی ہائے وہ جوانی کہ جس سے تھا لطفِ زندگانی
ظہیر پیری وبالِ جاں ہی۔ کہ جان ہی زیست کی نہیں ہی

(۴۴) شاد ۱۸۶۲ع

شاد۔ سر مہاراجہ بہادر کشن پرشاد یمین السلطنۃ پیشکار و سابق مدار المہام دکن آپ مہاراجہ چندولال آنجہانی کے نواسے اور جانشین ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۰ ماہ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ بروز پنجشنبہ مطابق ۱۸۶۲ء عیسوی حیدر آباد میں ہوئی۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی کے سوا

اور بھی چند زبانوں پر عبور ہے۔ اُردو و فارسی اور بھاشا میں نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے ہیں آپ کی طبیعت کا رجحان تصوف کی طرف بہت بڑھا ہوا ہے۔ بزرگوں کی خدمت اور کتب بینی نے آپ کے اس رنگ کو خوب پختہ کر دیا ہے۔ فن سخن سے خداداد مناسبت ہے۔ حضرت آصف غفران مکان سے شرف تلمذ ہے۔ طرز جدید و قدیم دونوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں نظم و نثر کی متعدد تصانیف کے منجملہ آپ کا دیوان نعتیہ موسوم بہ "خمکدۂ رحمت"، رباعیات شاد کلام شاد۔ بزم خیال۔ بیاض شاد۔ مخزن القوافی وغیرہ شایع ہو چکی ہیں۔ کلام میں سلاست کا حصہ بہت زیادہ ہے جو آپ کی روانیِ طبع کا شاہدِ عادل ہے۔ کلام کو ہوا و ہوس کے ان شرمناک مضامین سے جن سے روحانیتِ شعر فنا ہو جاتی ہے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔

نمونہ کلام یہ ہے

(۲۰۷) غزل

بادۂ خمخانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چُور رہوں مستی میں ایسا بیخود و بیہوش ہوں

گرد پھرنے دے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے
مثلِ ساغر دور میں بادۂ سرجوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں نوا سنجِ حقیقت لاکھ ہیں خاموش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر پیکرِ خاموش ہوں

کس کی فرقت وصل کس کا اور ہے معشوق کون
شاد میں اس عالمِ تکوین کا ہم آغوش ہوں

(۲۰۸)

اگر ظاہر نہ ہر صورت میں صورت آفریں ہوتا
پتا اُس کا کہیں ملتا، نشاں اُس کا کہیں ہوتا

تمھارے وصل کا بے شک یقیں ہوتا یقیں ہوتا
کسی تدبیر سے بھی محو گر خطِ جبیں ہوتا

کسی کا ہو کے رہنا یا کسی کو اپنا کر رکھنا
وہ تم سے ہو نہیں سکتا ہے یہ مجھ سے نہیں ہوتا

پلٹ کر دیکھ لیتا جاتے جاتے گر مرا قاتل
مجھے تجھ سے بھی شکوہ ہے نگاہِ واپسیں ہوتا

نکلتا ناوکِ انداز گر نیچی نظر سے بھی
تو دل کے پار ہوتا گر نہ ہوتا دل نشیں ہوتا

جو وہ بے پردہ ہو جاتا کلیم اللہ کی خاطر
قیامت تھی قیامت کا تماشا پھر وہیں ہوتا

حسینِ عہد لاکھوں ہیں کوئی اک آدھ ملتا ہے
محبت کا اثر ہر ایک کے دل پر نہیں ہوتا

اگر پردہ دوئی کا دور ہو جاتا نگاہوں سے
تو مجنوں کو نہ ہجرِ لیلیِ محمل نشیں ہوتا

کہاں ممکن ہے صبر و عشق دونوں کا بہم ہونا
جو یہ ہو وہ نہیں ہوتا جو وہ ہو یہ نہیں ہوتا

نہ لینا امتحاں وہ بت اگر شیخ و برہمن کا
خدائی میں کسے پھر امتیازِ کفر و دیں ہوتا

ہو الاول ہو الآخر ہو الظاہر ہو الباطن
یہ ظاہر ہے مگر پھر بھی کہیں ظاہر نہیں ہوتا

عبادت کے لیے بھی شاد اطمینان لازم ہے
پریشانی میں کوئی کام ہو دل سے نہیں ہوتا

(۲۰۹)

اُس چشمِ سرمگیں سے میں سرمہ در گلو ہوں
دل میں ہیں آہ نہ میں خاموش گفتگو ہوں

اک مدعائے نایاب آوارہ کر رہا ہوں
جس کی طلب میں ہر دم سرگرمِ جستجو ہوں

غفلت ہے کس بلا کی اتنی خبر نہیں ہے
کھویا ہے کس کو میں نے کیوں محوِ جستجو ہوں

اپنا ہوں آپ عاشق معشوق بھی ہوں اپنا
کس کو طلب کروں میں اپنی میں آرزو ہوں

دل میں نہیں سماتی ہے جوش پر مے عشق
اس میکدہ میں ساقی لبریز اک سبو ہوں

اقرب ہے شاہ رگ سے ہے دور ہر مکاں سے
ڈھونڈوں کہاں میں اس کو یا ہوں میں جستجو دل

ہوں بختِ نارسا سے حرماں نصیب ایسا
پاتا نہیں ہوں اس کو گو محوِ جستجو ہوں

دونوں جہاں ہیں مجھ میں نیرنگیاں ہیں مجھ میں
عالم کا ہوں تماشا عالم کی آرزو ہوں

نغمے بھرے ہیں مجھ میں اسرار قدرتی کے
تارِ نفس سے ہر دم اک سازِ گفتگو ہوں

قاتل کی ٹھنڈی گرمی خنجر سے کوئی پوچھے
آب تاک رگ جہاں میں افسردہ میں ہو ہوں

ہے کون دوست میرا دشمن ہے کون میرا
ہوں دوست شاد اپنا اپنا ہی میں عدو ہوں

(۸۵) بے نظیرؔ ۱۸۶۳ء

سید محمد بے نظیر شاہ وارثی۔ سال پیدائش ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء عیسوی۔ عربی فارسی کے فاضل ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں۔ علم طب بھی پڑھا ہے۔ اس کے متعلق آپ کو جدید نباتات کی تحقیقات کا شوق ہے۔ اصل وطن کڑا مانک پور ضلع الہ آباد ہے مدت سے حیدرآباد میں قیام ہے۔ فن شعر میں خاصی مہارت ہے۔ اردو غزل میں آپ مولانا

۱؎ ۱۹۲۶ء میں انتقال ہو گیا۔

وحید اللہ الہ آبادی مرحوم سے مشورہ لیتے تھے قصیدہ اور مثنوی میں اکثر منشی امیر احمد مینائی سے اصلاح لی ہے۔ آپ کے کلام کا بہت بڑا حصہ ۱۸۹۵ء میں ایک سفر کے دوران میں گم ہو گیا۔ ایک مثنوی الکلام جس میں جا بجا مناظرِ قدرت اور صحیح جذبات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں ۱۳۰۳ھ میں نولکشور پریس میں طبع ہوئی ہے جس کا انتخاب ذیل میں دیا گیا ہے۔ غزل کا نمونہ یہ ہے:

غزل (۲۱۰)

نہ رہا حجابِ نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں
تو رہا نہ تیرے سوا کوئی پسِ پردہ حسنِ مجاز میں

وہی عین ہے جو خیال ہے یہ مری حقیقتِ حال ہے
کہ شراب ہوں میں مے کشی تو نماز ہوں میں نماز میں

نہ ہوئی یہ آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو تو ہی خم ہے زلفِ ایاز میں

عجب ایک حال ہے کہ نقابِ حسنِ جمال ہے
جو نہاں بھی ہو کے عیاں ہے تو وہ اک ہے کوئی راز میں

یہ جہاں نہیں ہے آئنہ ہے تصورِ ہمہ وا ہمہ
وہی جلوۂ آئنہ ساز کا ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

ہمہ تن تصورِ دید ہوں طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کش ہیں خموشیاں مرے دل کے پردۂ راز میں

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا تری شانِ لطف میں فدا
کہ جلال میں بھی کمی نہیں ترے عفوِ بندہ نواز میں

جو اسیرِ بندِ بلا ہوئے وہی قیدِ غم سے رہا ہوئے
وہ پھنسے بھی جو پھنسے نہ تھے ترے دامِ زلفِ دراز میں

تو چراغِ دیر و حرم ہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو سنے
کہ تمام رات بسر ہوئی کسی کی سوز و گداز میں

پسِ مرگ دادِ وفا ملی میرا دستِ دعا ملی
کہ تری وفا نے اٹھا لیے مرے پھول دامنِ ناز میں

نہ عروج کچھ نہ نزول ہے یہ خیال و وہم فضول ہے
جو بلندیاں ہیں نشیب ہیں وہی پستیاں ہیں فراز میں

تری شکل کھینچ کے رکھ دیا جو قلم قضا نے سبب یہ تھا
کوئی نقشِ حسن نہیں رہا ہے کلکِ نقش طراز میں

یہ نوا جو شعلہ فروز ہے یہ دھنیں جو سامعہ سوز ہیں
مرے سوز ہی کی آگ ہے ترے راگ میں مرے ساز میں

دلِ زار ہند میں کیوں نہ ڈرے مجھے دفن کوئی کہیں کرے
مری خاک بھی جو اڑی کبھی ترے در پہ ہوگی حجاز میں

جو بنا یہاں وہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بے نظیر رواج ہے رہِ عشق شعبدہ باز میں

(۲۱۱)

کیوں اس قدر جہان کی خاطر پہ بار ہوں
تیرا فراق ہوں نہ ترا انتظار ہوں

داغوں سے رنج دہر کے میں لالہ زار ہوں
اب یہ داغ ہے تری آنکھوں میں خار ہوں

کیا ہو گئی امیرِ غریب کی بربادیِ چمن
دعویٰ جہاں ختم کہ یہ ہو میں بہار ہوں

یوں اس گلی کی خاک میں مل مل کے مل گئے
ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ میں اک مزار ہوں

برباد ہو کے بھی مجھے اچھی جگہ ملی
دل سے ترے نکل نہ سکا وہ غبار ہوں

کر لینگی خود اسیر مری نغمہ سنجیاں
صیاد گر ہے آپ تو میں بھی ہزار ہوں

آتے ہیں یہ لبوں کے دن آئی شوقِ مرگ ہ
گھوڑے پہ ہیں وہ آکے ابھی سے سوار ہوں

کیا شے ہے دردِ عشق مجھے کچھ خبر نہیں
کچھ تو مگر ضرور ہے جو بے قرار ہوں

کیا کم یہ اجرِ حسرتِ دیدار کا ملا
یہ بھی بہت ہے جو تری آنکھوں میں خار ہوں

یاد آ گئی وہ جنبشِ ابرو غضب ہوا
ہر آن وہ کہتی ہے خنجر کی دھار ہوں

بے ہوش ہو رہا ہوں خیالِ نگار میں
چھایا ہے سارے باغ پہ رنگِ فغاں مرا
ساقی جو پی ہو غیر کے ہاتھوں سے تو حرام
دنیا سے اٹھ گیا میں فقط اس خیال سے
جو مردہ آرزو ہے وہ میرے ہی دل میں ہے
اس آب و تاب سے بھی یہ کہتی ہے کہکشاں
خود اپنے دل کی آگ سے جلتا ہوں رات دن
ساقی وہ آفتاب چھپا وہ اذاں ہوئی

اللہ ہے جواب میں کبھی ہوشیار ہوں
اس سے غرض نہیں کہ خزاں ہوں بہار ہوں
رندی میں بھی یہ آن ہے پرہیزگار ہوں
ایسا نہ ہو کہ آپ کی خاطر پہ بار ہوں
دنیا کی حسرتوں کا میں گویا مزار ہوں
اترا ہوا کسی کے گلے کا میں ہار ہوں
رونق ہوں باغِ دہر کی لیکن چنار ہوں
دے جلد بھر کے جام کہ میں روزہ دار ہوں

زخمی تڑپ رہا ہوں مگر اے بے نظیر
یہ بھی خبر نہیں کہ میں کس کا شکار ہوں

(۲۱۲)

نہ رہے اکیلے جنوں میں بھی یہ تلاشِ ہمسفری رہی
خرد و حواس جو چل بسے تو جلو میں بے خبری رہی
ہوئے خشک سب پھول چمن جلا، کہیں نام کو نہ تری رہی
یہی اپنے زخم ہرے رہے یہی اپنی آنکھ بھری رہی
نہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شرابِ ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

نہ کدورت اپنی وفا میں ہے نہ غبار اپنی صفا میں ہے
اسے جس قدر بھی کسا گیا یہ کسوٹیوں پہ کھری رہی

جو تمیزِ حال ہوا ہوئی، طلبِ سکوں بھی فنا ہوئی
نہ دماغ میں وہ جنوں رہا نہ خیال میں وہ پری رہی

وہ ملال تھا کہ نکل گیا وہ خیال تھا کہ بدل گیا
مرے شکوے ایسے کبھی نہ تھے جو طبیعت ان کی بھری رہی

مری فردِ جرم کو دیکھ کر یہ خیال تھا کہ اٹھے نظر
یہی ایک شکل امید تھی وہی آج تک نظری رہی

تری تیغ بھی کوئی خضر تھی۔ یہ اثر جو چل کے دکھا گئی
کوئی پنکھڑی گلِ زخم کی ہوئی خشک بھی تو ہری رہی

رہے باخبر تو نہ یہ کھلا کہ مآل و غایتِ عشق کیا
ہوئے بے خبر تو خبر ہوئی کہ خبر سے بے خبری رہی

کوئی حشر تک بھی نہ لکھ سکا مرے کارنامے تو بھلا ہوا
کہ قرار دادِ گناہ سے مری فردِ جرم بری رہی

تری چشمِ مست کی یاد تھی مری روح نزع میں شاد تھی
کہ شراب گو نہ میں پی سکا مرے سامنے تو دھری رہی

مجھے پاسِ وضع ضرور تھا یہ کمالِ عقل و شعور تھا
مری پردہ پوشیِ جنوں ۔ مری مشق پردہ دری رہی

تری خاکِ در مجھے مل گئی تو ہوس نہ دل میں رہی کوئی
نہ وہ کیمیا کی طلب رہی نہ طلب کی دربدری رہی

وہ ہزار در پئے کیں رہا وہ ہزار پردہ نشیں رہا
وہی بے نظیرِ حزیں رہا وہی اس کی جلوہ گری رہی

(۲۱۴)

اس جگہ آ کر گرے ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے
وہ نکل جاتے ہیں اکثر سر کو ٹھکراتے ہوئے

اتنی مدت تو جنوں میں رہا پابندِ وضع
شرم آتی ہے مجھے اب ہوش میں آتے ہوئے

دیکھنا اس سے نہ کہدے کوئی تیرے منہ کی بات
یہ بھی کہدیتے ہیں مجھ کو یاد فرماتے ہوئے

کچھ نہ لایا ساتھ کوئی کچھ نہ کوئی لے گیا
دیکھ ڈالے سیکڑوں آتے ہوئے جاتے ہوئے

تیرے مجنوں اب چمن کی سیر کے بھوکے نہیں
ہیں گزرتے بیاباں کی ہوا کھاتے ہوئے

ہم نہ سمجھے تھے کہ بن جائے گی تیری جان پر
خیر اتنا تو کہا ظالم نے شرماتے ہوئے

غنچوں کی قدر دانی دیکھ لو ابرِ بہار
لے چلے میرا جنازہ پھول برساتے ہوئے

کر لیے پہلے تو ہر حلقے میں لاکھوں دل اسیر
اب الجھتے ہیں وہ کیوں زلفوں کو سلجھاتے ہوئے

اس لیئے وہ پوچھتے ہیں ظلم اپنے بار بار
رنج ہوتا ہے مجھے یہ قصہ دہراتے ہوئے

معذرت اپنی نہیں ہوتی ہے کافی اے امید
دیر لگتی ہے وہاں کیا رحم فرماتے ہوئے

اس سفر میں ہر قدم پر مل گیا توشہ ہمیں
پہونچے منزل پر برابر ٹھوکریں کھاتے ہوئے

تنگ تھا میدانِ عالم اے جنوں تو کس لیئے
وسعتِ صحرانہ دیکھی پاؤں پھیلاتے ہوئے

اس قدر ناکامیوں کا خوف رہتا ہے کہ اب
دل میں ڈرتا ہوں خیالِ آرزو لاتے ہوئے

آمد و شد میں جہاں کی صرف دو دم کا ہے فرق
ایک دم آتے ہوئے اور ایک دم جاتے ہوئے

مٹ گئے پامالیوں سے وہ بھی آخر اے نظیر
کچھ نشاں تھے جن کی قبروں کے ادھر جاتے ہوئے

(۲۱۴)

تیرے رخ پہ جم کر نظر رہ گئی
یہی ہم سے اور فتنہ گر رہ گئی

ادھر رہ گئی یا ادھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

نہ کچھ بھی رہا تو بھی سب کچھ رہا
تری یاد دل میں مگر رہ گئی

کمی کر گئی کیوں نگاہِ عتاب
پہونچ کر سناں تا جگر رہ گئی

کبھی کہہ دیا تھا کہ مرتا ہوں میں
شکایت انھیں عمر بھر رہ گئی

میں اٹھنے کو اٹھا تو اس بزم سے
طبیعت وہیں بیٹھ کر رہ گئی

کہا اس نے دھوکے سے باتیں یہ تم
تری بات اے چارہ گر رہ گئی

ادا سے وہ ٹھکرا کے چلتے ہوئے
قیامت مری جان پر رہ گئی

پھنسی دل میں تیری سناں ٹوٹ کر
یہ ظالم نہ رہتی مگر رہ گئی

مصیبت کو بھی وا دل جائے گی
مرے ساتھ کچھ دن اگر رہ گئی

کہاں جا کے ٹھنڈی ہوئی آہِ گرم
پہونچکر قریبِ اثر رہ گئی

خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا
نظر تو ترے بام پر رہ گئی

پھر آئی نہ غربت میں یادِ وطن
وہ کم بخت بھی جا کے گھر رہ گئی

تری شامِ گیسو کی خوشبو کہاں
گلوں تک نسیمِ سحر رہ گئی

غنیمت ہے جس کو عداوت نہ ہو
محبت بس اب اس قدر رہ گئی

یہ کیا کم سزا سر بلندی کی ہے
کہ جھک کر فلک کی کمر رہ گئی

چلا جب یہ کہکر پکارا اُسے
یہ بات اور اک نامہ بر رہ گئی

بلا ہی بلا تھی محبت تری
وہ قسمت میں میرے ہی سر رہ گئی

کوئی دم میں ہے ختم طولِ حیات
یہ منزل بہت مختصر رہ گئی

یہ کہتی ہے ہر داستانِ کہن
مسافر سدھارے خبر رہ گئی

کہاں عشق میں عقل کو یہ خبر
گئی کس قدر کس قدر رہ گئی

اُٹھے ہو کے مایوس ہر در سے ہم
بس اک تری رہ گزر رہ گئی

بڑی خیر گزری کہ اک ضبطِ آہ
انھیں ہوتے ہوتے خبر رہ گئی

نہ توڑ اُنھیں غیر سے بے نظیر
محبت میں اتنی کسر رہ گئی

انتخاب مثنوی "الکلام"

(٢٢٥) برسات کا سماں!!

جو سوکھی زمیں پر ترشح ہوا
نکلتی ہے بو سوندھی سوندھی سی کیا

گرجتے ہیں بادل چمکتی ہے برق
ہوا صحن کا صحن پانی میں غرق

گئی بند اچٹ پانی کے شور سے
بہے جاتی ہیں نالیاں زور سے

ٹپکتی ہے بنگلے کی وہ اولتی
کہ ہے تار ریشیں کی چلمن پڑی

ہوا زور سے چلتی ہے بار بار
پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوار

بنا ہے جو وہ ٹین کا سائباں
ہے اس وقت ارگن کا اس پر گماں

عجب ڈھب سے پانی برستا ہے آج
کہ زاہد بھی مے کو ترستا ہے آج

چٹانوں پہ کیا لطفِ نظارہ ہے
کہ جو بوند ہے ایک فوارہ ہے

صبا کے طمانچے جو کھاتے ہیں آج
تو پودے سروں کو جھکاتے ہیں آج

چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار
ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار

دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر
فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر

اٹھی شاخِ گل سبزے کو چوم کر
برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر

ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ
ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ

یکایک رکی بوند ٹھہری ہوا
نظر آتی ہے اور ہی کچھ فضا

(۲۱۶). صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا منظر

ہے کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر — شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر
تری اوس کی دھوپ کھونے لگی — ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
پرندے زمیں پر اُترنے لگے — ہرن کُھل کے جنگل میں چرنے لگے
اُڑے کھول کر قاز و سرخاب پر — گرے مرغ آبی وہ تالاب پر
وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں — وہ چُن چن کے دانے اُٹھانے لگیں
ہُوا پھر وہی کاروبارِ جہاں — ہوئے لوگ مصروفِ کارِ جہاں
ہَوا میں ابھی تک نہیں کچھ غبار — رطوبت لگی اُڑنے بن کر بخار
مگر شہر میں یہ نہیں آب و تاب — کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب
بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی — وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی
مُنڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی — اُتر کر وہ در پر چمکنے لگی

(۸۶) ریاض ۱۸۶۳ء

ریاض منشی ریاض احمد خلف سید طفیل احمد خیرآبادی سابق ایڈیٹر ریاض الاخبار عاشقانہ معاملات رندانہ مضامین خوب ادا کرتے ہیں۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں ممتاز ہیں

کلام میں شوخی کا پورا انداز ہے۔ کہنہ مشق ہیں۔ اب محمود آباد کی ریاست سے وظیفہ پاتے ہیں۔ اپنے وطن خیرآباد میں مقیم ہیں۔ دیوان زیرِ طبع ہے۔ سال پیدائش تقریباً ۱۸۵۳ء مطابق سنہ ۱۲۷۰ھ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے (افسوس کہ سنہ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوگیا۔)

غزل (۲۱۷)

تربت ہماری دیدۂ حسرت چمن میں تھی
محتاج چار پھولوں کی تربت چمن میں تھی

اُجڑا جب آشیاں تو خزاں کیا بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

چُنتا نہ پھول ہاتھوں کے کانٹے نکالتا
اہی جوشِ گل مجھے کہیں فرصت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنکے چنوں چمن کی یہ خدمت چمن میں تھی

خم لیکے کنجِ باغ میں بیٹھے تھے چھپ کے ہم
بزمِ چمن سے دور یہ خلوت چمن میں تھی

صیّاد گھر ترا مجھے جنت سہی "مگر"
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

چنگاریاں جو باغ میں پھیلی نہیں پھول تھے
بادِ بہار کی یہ شرارت چمن میں تھی

قیدِ چمن میں جان بھی نکلی نہ ضعف سے
رکھی ہے اب قفس میں جو طاقت چمن میں تھی

رہتا تھا ہم سے دور بہت شورِ باغباں
آزادیوں کی سچی مسرّت چمن میں تھی

سامان سب تھے آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاضؔ کی تربت چمن میں تھی

(۸۷) مضطر ۱۸۶۵ء

مضطر خیر آبادی سید افتخار حسین ولد مولانا سید حافظ احمد حسین رضوی ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش لفظ "افتخار" سے نکلتی ہے۔ آپ شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق صاحب منطقی کے حقیقی بھانجے ہیں۔ عربی۔ فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو اپنے زمانے کی لائق ادیبہ تھیں۔ فن شعر میں حضرت امیر مینائی سے تلمذ ہے۔ طبیعت حاضر پائی ہے۔ بہت زود گو ہیں۔ نواب صاحب ٹونک کے اُستاد ہیں۔ افتخار الشعرا کا خطاب حاصل ہے۔ اب ریاست گوالیار میں لازم ہیں ایک دیوان "نذر خدا"، جو توحید میں ہے چھپ گیا ہے ۶۲ سال کی عمر میں ۱۲ رمضان ۱۳۴۵ھ کو انتقال ہو گیا۔ قلعہ گوالیار کے پہلو میں مزار جھینگا شاہ کے قریب دفن ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے

(۲۱۸) غزل

سچ یہ ہے کہیں کون متاعِ دل و دیں کا
وہ آپ ہی مالک ہے یہ سب کچھ ہے تمھیں کا

چھانا ہے جگر میری دعاؤں نے فلک کا
پیسا ہے کلیجا مرے نالوں نے زمیں کا

دن رات تمنا ہمیں کچھ کچھ ہے کسی کی
دن رات تصور ہمیں کچھ کچھ ہے کہیں کا

بہ وصل کی خواہش ہے یہ منہ دیکھ کے بولے
لکھا تو مٹا ڈال خطِ لوحِ جبیں کا

کھویا مرے جینے کا مزہ موت نے مضطر
اللہ کرے صبر تڑپے جانِ حزیں کا

(۸۸) جلیل سنہ ۱۸۶۹ء

جلیل۔ حافظ جلیل حسن ابن مولوی حافظ عبد الکریم صاحب مانک پور ضلع الہ آباد کے رہنے والے پچاس سال کے قریب عمر ہے۔ سالِ ولادت تقریباً سنہ ۱۸۶۹ء مطابق سنہ ۱۲۸۶ ہجری بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مینائی کے بمقام رامپور شاگرد ہوئے۔ تمام و کمال فیض اُنھیں سے حاصل کیا۔ اب اُن کے جانشین کہلاتے ہیں۔ امیر اللغات کے دفتر میں عرصہ تک سکریٹری رہ چکے ہیں۔ حیدرآباد میں بھی منشی صاحب کے ہمراہ تھے۔ اس وقت سرکار نظام کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہیں۔ نواب فصاحت جنگ کے خطاب سے سرفراز ہیں۔ دو دیوان شایع ہو چکے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۲۱۹) غزل

حسن و الفت میں خدا نے ربط پیدا کر دیا ۔۔۔ دردِ دل مجھ کو دیا تم کو مسیحا کر دیا

خوب کی تقسیم تو نے اے خیالِ زلفِ یار ۔۔۔ دل کو نذرِ داغ، سر کو وقفِ سودا کر دیا

جان لے لینا جلانا کھیل ہے معشوق کا ۔۔۔ آنکھ سے مارا لبِ نازک سے زندہ کر دیا

مجھ کو شکوہ ہے کہ دل کا خون قاتل نے کیا ۔۔۔ دل یہ کہتا ہے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

ناز ہو یا دلبری افسوں ہو یا جادوگری ۔۔۔ سب کو قدرت نے تری چتون کا حصہ کر دیا

دل ادھر رخصت ہوا ہوش اُس طرف چلتے ہوئے
کس کی آنکھوں نے یہ در پردہ اشارہ کر دیا

میں کہاں اُلفت کہاں یہ سب کرشمے دل کے ہیں
تم پہ شیدا ہوا مجھ کو بھی شیدا کر دیا

مرحبا اے ساقیِ جادو نظر صد مرحبا
مست آنکھوں نے مرا نشہ دوبالا کر دیا

میں تو ایسا جانتا تھا تیری چشمِ شوخ کو
فتنے برپا کرتے کرتے حشر برپا کر دیا

دل تڑپتا ہے تو کچھ تسکین ہوتی ہے جلیل
جی بہلنے کو خدا نے درد پیدا کر دیا

(۲۲۰)

دردِ دل لاکھ کہو اُن پہ اثر کچھ بھی نہیں
دل میں رہتے ہیں مگر دل کی خبر کچھ بھی نہیں

دیکھنے کو تو سبھی رکھتے ہیں آنکھیں لیکن
تو نظر آئے نہ جس کو وہ نظر کچھ بھی نہیں

کیا محبت وہی دو دل میں ہوا کرتی ہے
اس طرف جان پہ آفت ہے اُدھر کچھ بھی نہیں

شمع اس فکر سے محفل میں گھلی جاتی ہے
رات بھر کا ہی سماں وقتِ سحر کچھ بھی نہیں

ہو چکی دیدۂ گریاں کی گہر افشانی
اب تو دامن میں بجز لختِ جگر کچھ بھی نہیں

آ چکی ہے شبِ فرقت میں قیامت سو بار
اور ابھی خیر سے آثارِ سحر کچھ بھی نہیں

یاس ہوتی ترے ملنے سے تو بہتر ہوتا
نخلِ اُمید سے اُمیدِ ثمر کچھ بھی نہیں

کوئے جاناں میں یہ جانے کا نتیجہ ہے جلیل
کھو گئے ہوش کچھ ایسے کہ خبر کچھ بھی نہیں

(۸۹) اقبال سنہ ۱۸۷۶ء

اقبال۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے سنہ ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں اپنے وطن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ طرز جدید کے شعرا میں نامور ہیں۔ فارسی میں اعلیٰ درجہ کی استعداد رکھتے ہیں۔ عربی اور سنسکرت میں بھی کسی قدر دخل ہے۔ انگریزی میں ایم۔ اے پاس ہیں۔ تعلیم انگلستان اور جرمنی میں پائی۔ آپ کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی مل چکی ہے۔ لاہور میں بیرسٹرایٹ لا ہیں شاعری کا شغل بھی جاری رہتا ہے۔ عُلوِ تخیل اور بیدردانہ فکر ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے ان کا کلام۔ سوزِ فطرت اور مناظر قدرت سے ان کی محبت کا پتا دیتا ہے ان کا یہ ترانہ ملک بھر میں مشہور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو سر کا خطاب بھی مل گیا ہے۔

(۲۲۱) ترانہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
ممکن نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خون تیری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اِس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

(٢٢٢)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(۲۲۳)

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ ہائے سیاہ کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
تجھے کیا بتائیں ہم نشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا
نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا وصلِ دیدارِ یار ہوگا ✓
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

see page 264 ... 233 (Gazal). This poem is in full there

نہیں رہا اب وہ دور ساقی کہ چھپکے پیتے تھے پینے والے
جہان سارا بنے گا میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنالے گا کاروان مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
وہ یہ سمجھتا ہے اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

(۲۲۵)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری

میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

مرا عیش غم۔ مرا شہد سم۔ مری بود ہم نفس عدم
ترا دِل حرم۔ گرو عجم۔ ترا دیں خریدہ کافری

تری راکھ میں ہی اگر شرر۔ تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہان میں نانِ شعیر پر ہی مدارِ قوتِ حیدری

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے ای چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہی
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

کرم ای شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہی جنھیں دماغِ سکندری

(۲۲۶) شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں۔ سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں۔ محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں۔ اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہی مجھکو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہی مجھکو

ہی بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہی اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اِسی دُنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کونسی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی
اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی
کس کی تکبیر سے دُنیا تری بیدار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لیکر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

اُمتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں
اُن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں اُن کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے؟ کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے رُسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دُنیا
رہ گئی اپنے لیئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دُنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دُنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دُنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دِل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلا لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب اُنھیں ڈھونڈ؟ چراغِ رُخِ زیبا لیکر

دردِ لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
نجد کے دشت جبل میں رمِ آہو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
بت گری پیشہ کیا، بت شکنی کو چھوڑا
رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنی کو چھوڑا

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
مضطربِ دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم رضا بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں. تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لیئے دل تو نے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟

ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیسِ دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگرسوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا! مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا! لے تو حجازی ہے مری

(۲۲۷) پرندے کی فریاد

بچوں کے لیے

آتا ہی یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہی چوٹ دل پر آتا ہی یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی ای کاش میرے بس میں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہی یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہی یہ حال ہو گیا ہی
دل غم کو کھا رہا ہی غم دل کو کھا رہا ہی

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہی

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(۲۲۸) ایک آرزو

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دُنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلھن کو
سُرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

تو پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

(۲۲۹) سیّد کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ

زنگ آلود ہے آئین ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے

ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
پاک کھ اپنی زبان تلمیذ رحمانی ہے تو

شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(۲۳۰) چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن
قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنج رہ منزل سے تو
آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں
میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے میرے دل میں ہے
تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا۔ عشق میرا نور ہے
انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حسنِ ازل
پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہی ذوقِ آگہی سے دور تو
احساسِ وجود حقیقت ماشوق

جو مری ہستی کا مقصد ہی مجھے معلوم ہی
یہ چمک وہ ہی جبیں جس سے تری محروم ہی

(۲۳۱) پیامِ عشق

سُن ای طلبگارِ دردِ پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہوجا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہوجا
نہیں ہی وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہی تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہوجا
غرض ہی پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہی تو، ادا مثالِ نماز ہوجا
نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قایم ہی شان تیری
وفورِ گل ہی اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہوجا
گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہی صحرانوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں میانِ محفل گداز ہوجا

وجود افراد کا مجازی ہی، ہستی قوم ہی حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی، آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

غزل (۲۳۲)

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہی گویا مزار ہی حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قایم ہی شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہی مجھ کو سامان آبرو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنّا
الٰہی تیرا جہان کیا ہی! نگار خانہ ہی آرزو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی، غبار تھا کوے آرزو کا

اگر کوئی شی نہیں ہی پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنّا ہی، دل کو سودا ہی جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

غزل (۲۳۳)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا

گزر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیرِ میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہی داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہی کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
جو ایک تھا ای نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہی تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کا خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
یہ رسم بزم فنا ہی ای دل! گناہ ہی جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا
نہیں ہی غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہی اس کی
کہیں سر رہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا

(۲۳۴) فلسفۂ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کے نام)

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے 'الم' کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل، غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور رہی
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور رہا

ہے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہی حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزمگاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو، اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیِ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(۲۳۵) خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

"غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را"

(٢٣٦) فاطمہ بنت عبداللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت، حور صحرائی! تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر!

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی!
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

(۲۳۷) والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجامِ غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِّ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ! میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
سایۂ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر!
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت!
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیرِ فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نُہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاکِ گلستاں ہیں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں

خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ! غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ! سیمابِ پریشاں انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں ممنونِ شب ہے جن کا سوز

عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے

پھر یہ انساں، آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثالِ شمعِ روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے
جس کا ناخن سازِ ہستی کے لیے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشوونما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے

سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ!

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہے لادوا
زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے

وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشکِ پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کے سرشک آباد سے

ق

آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے
اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

رختِ ہستی خاکِ غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دل آسائی، فراموشی نہیں!

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں	تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر	خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا	نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(۹۰) ناظر ۱۸۷۲ء

چودھری خوشی محمد خاں بہادر خلف چودھری مولیٰ داد خاں۔ ہریاوالا ضلع گجرانوالہ کے باشندے ہیں۔ سال پیدائش تقریباً ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ ہے ۱۸۹۳ء میں علیگڑھ کالج سے بی اے پاس کیا۔ زمانہ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ فن سخن میں خواجہ حالی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ ریاست کشمیر میں عہدۂ گورنری پر مامور ہیں۔ غزل گو نہیں ہیں صرف حالیہ نظمیں لکھتے ہیں جو علوِ خیال کے لحاظ سے پسند کی جاتی ہیں

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

(۲۳۸) جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گلشن تھی ۔ جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ۔ ہر کوہ پہ جلوۂ طور رہا

جب بادِ صبا مضراب بنی ۔ ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ۔ ہر سروِ چمن طنبور بنا

سب طائر مل کر گانے لگے ۔ عرفاں کی تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے ۔ دلکش وہ سماع ِ طیور رہا

سبزے پہ بساط بچھائی تھی ۔ اور بزم سرور سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں ، فرشِ سنجاب و سمور رہا

تھا دلکش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے ۔ پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی

یاں برف کے تودے گلتے تھے ۔ چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے ۔ نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹاؤں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر۔ اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر۔ جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ۔ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ۔ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے۔ یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکے ستاتے ہو
ہیں پنچھ پکھیرو بن باسی۔ تم جال میں آکے پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا۔ کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگھی ساتھی کا۔ تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص وہوا کو چھوڑ چلے۔ اس نگری سے منہ موڑ چلے
ہم جو زنجیریں توڑ چلے۔ تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی۔ ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی۔ تم اُس کو آکے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے۔ من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑائی بہتیرا ہے۔ تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پہ یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے. پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی. مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو. چتون پہ میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں. پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نور رحمٰن راجوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں، سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں، نگر میں، ساگر میں، ہر اُترا ہے ہرجا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے. واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساغر چلتا ہے. چل کے دل بہلا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے. ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی. بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے. پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت. اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت. سادھو کی ہے بن میں جا بابا

ہی شہروں میں شورشِ نفسانی۔ جنگل میں ہی جلوۂ نورانی
ہی نگری ڈگری کثرت کی۔ بن وحدت کا دریا بابا

ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں۔ چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں۔ پرجا کی نہیں پروا بابا

سر پر آکاس کا منڈل ہی دھرتی پہ سُہانی مخمل ہی
دن کو سورج کی محفل ہی۔ شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبورہ بجاتے ہیں۔ گاتی ہی ملار ہَوا بابا

یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں۔ پیتم کے سندیس سُناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں۔ پھل پھول اور گیا بابا

ہی پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں۔ اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سِل پتّھر اینٹ۔ مکان تمھیں۔ دیتے ہیں سکھ سے چھڑا بابا

تن من دھن ہر لگاتے ہو۔ پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لال گنواتے ہو۔ تم بندۂ حرص ہَوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہی یہ دُنیا رام کہانی ہی
یہ عالم۔ عالمِ فانی ہی۔ باقی ہی ذاتِ خدا بابا

(۹۱) نظامی بدایونی سنہ ۱۸۷۲ء

نظامی۔ نظام الدین حسین ولد منشی فخرالدین ساکن بدایوں سنہ ۱۲۸۸ھ مطابق سنہ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے ملتا ہی۔ ابتدائے سن شعور سے شعر و سخن سے ذوق ہی۔ شاعری میں سب سے پہلے حضرت بیخود بدایونی مرحوم سے استفادہ حاصل کیا۔ اس کے بعد حضرت حالی سے اصلاح لی۔ زمانۂ طالب علمی سے مضمون نگاری کا شوق تھا۔ بعض اخبارات کو قلمی مدد دیتے رہے۔ ہمیشہ علی گڑھ کالج اور قومی تعلیم کے مسئلہ پر خامہ فرسائی کی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں بدایوں سے اخبار ذوالقرنین نکالا جو اس وقت تک جاری ہی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں کلیات شیفتہ یعنی نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے فارسی و اُردو کلام کو ترتیب دیا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ لکھا جو حضرت شیفتہ کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب کے ایما سے نظامی پریس، بدایوں سے شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں اُردو دیوان غالب کی شرح لکھی اور اس کا خوبصورت مجلّد نسخہ شایع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ایک کتاب "قاموس المشاہیر" جس میں مشرقی مشاہیر کے مختصر حالات بہ ترتیب حروف تہجی دیئے گئے ہیں مرتب کی ہی اس کا پہلا حصہ شایع ہو چکا ہی دوسرا زیر طبع ہی۔ انتخاب زرّیں کے دوسرے ایڈیشن کے بعد دوسرا حصہ بھی شایع ہو گیا۔ صرف قومی نظمیں جو واقعات اور جذبات کا مرقع ہوتی ہیں لکھتے ہیں اُنکی مختلف نظموں کا ایک مجموعہ تجلیاتِ سخن کے نام سے سنہ ۱۹۲۰ء میں شایع ہو گیا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہی:۔

عرضداشتِ منظوم بہ پیشگاہِ خسروِ دکن خلد اللہ ملکہ بہ اُمیدِ قبولیتِ قاموس المشاہیر

(۲۳۹)

منبعِ فیض و کرم ہے بارگاہِ خسروی
جس طرف دیکھو دکن کی روشنی ہے جلوہ گر
صاحبِ اقبال آصفجاہ سُلطانِ دکن
ناخنِ تدبیر سے ہے عقدۂ دُشوار وا
وجد ہے نوشیرواں کو دنگ ہے کسریٰ کی عقل
تشنۂ علم و ادب سے چور ہیں سب اہلِ بزم
فکر ہے ہر دم کہ اُردو کا بہے ساغر رواں
ہو قبولِ شاہ یہ قاموسِ اردو کیا عجب

مطلعِ مہرِ سعادت رونقِ کاشانہ ہے
شمع ہے حسنِ ریاست اک جہاں پروانہ ہے
طالعِ روشن پہ صدقے حشمتِ شاہانہ ہے
ناز ہے اس پر فراست کو کہ وہ فرزانہ ہے
بارگاہِ عدل ہے یا اک تجلی خانہ ہے
ساقیِ عالی ہمم کے ہاتھ میں پیمانہ ہے
علم و فن میں ہو ترقی ذکر یہ روزانہ ہے
دفترِ تاریخ ہے، اسلاف کا افسانہ ہے

اے نظامی کیوں نہ ہو تو موردِ لطفِ نظام
پائے نسبت تیرے حق میں عہد کا پروانہ ہے

(۲۴۰) اسلام اور حکومت الٰہی کی بنیاد

یہ دہر میں ہے تقاضائے گردشِ ایام
شعاعِ حسن سے خلوت نشیں ہو لیلیٰ شب

نمودِ صبح سے ہو جلوہ ریز رحمتِ عام
طلوعِ مہر سے ہو پردہ پوش ماہِ تمام

ضیائے نور سے ہو محوِ تابشِ انجم
نہ ہوں گناہ کے بادل نہ قہر کی ہو گرج
وہ روشنی ہو نہ تاریکیاں رہیں باقی
چمن چمن کی فضا پر ہو اک نیا عالم
خدا کے حکم سے پوری ہوئی دعائے خلیل
منبعِ لطف کی رز نہاں ہوئیں کیا کیا
رہی نہ اہلِ قبائل میں کشمکش باقی
ہوئی رسول کو حاصل حکومتِ دارین
صلاح کار ہیں بے شک نبی کے وارث
حریفِ جوشِ عداوت تھی قوتِ اخلاق
دکھا سکے نہ کماندار تیر اندازی
زبانِ پاک سے نکلی صدائے آزادی
سیاسیات میں بے مثل آپ کی راہیں
صفائے روح تھی وحدت پرستیِ ملت
رہے خزانۂ عالم کے مالک و قابض
ہوئے نہ کام و دہن آشنائے لقمۂ تر
نہ فرش ہائے مکلف نہ پردہ ہائے حریر

نسیمِ صبح بچھائے سرور و کیف کا دام
عمل کسی کے نہ ہوں شکلِ گیسوئے شب فام
فروغِ جلوۂ تاباں ہو لمعۂ الہام
عرب بہار سے معمور ہر منور شام
زہے نصیب کہ تشریف لائے خیرِ انام
درِ جواد سے مخلوق کو ملا انعام
بنے وہ ایک ہی آقائے نامور کے غلام
بنا حضور کا دربار عدل گاہِ انام
بنا تھا نغمۂ جاوید یہ خدا کا پیام
کیا جو آپ نے وہ کر سکے نہ رستم و سام
بہادروں کی ہوئی تیغ اندرونِ نیام
رہا قفس نہ گرفتاریاں نہ حلقۂ دام
معاملات میں بے لوث آپ کے احکام
بقائے امن تھا آئینِ عدل کا انجام
بنے نہ طالبِ زر پھر بھی شاہِ ذوالاکرام
کیا نہ خلعتِ شاہانہ زینتِ اندام
نہ گھر میں کوئی سجاوٹ نہ رونقِ در و بام

بنا دیا مئے عرفاں سے مست عالم کو
کبھی ہوئی نہ تمنائے ساغرِ گل فام

نہ تاج و تخت کی پروا نہ خواہشِ زر بال
مگر تھے زیرِ نگیں قوم کے صغار و عظام

ہوئے وہ شیر و شکر ل کے تھے جو نیک سرشت
الگ الگ رہے محبوبِ حق سے نافرجام

دکھائی شانِ حکومت گلیم پوشی میں
نہ تھی نمایشِ کسریٰ نہ شوکتِ بہرام

غرض حکومتِ ملّی کی یہ نہ تھی ہرگز
خدا کے ملک میں قایم ہو خود سرانہ نظام

یہ تھا حضور کی آمد کا مقصدِ اعظم
کریں تمام خدائی کو دعوتِ اسلام

بڑھائے تزکیۂ نفس ذوقِ روحانی
ادب کے کوچۂ اخلاق میں ہوں گرم خرام

دریغ! ہم نے بھلائے اصولِ پیغمبر
فغاں کہ ہو گئے دنیا جہان میں بدنام

جو راہِ صدق میں ملت ہو حوصلہ فرسا
شریعتِ نبوی پھر بنے سبیلِ دوام

یہی ہے نذرِ نظامی یہی ہے ہدیۂ شوق
ہزار بار نبی پر درود اور سلام

(۲۴۱) جامع عثمانیہ

(انتخاب از قصیدہ سال گرہ ہمایوں)

بنا رہا ہے تغیر نظامِ عالم کا
کہ علم سے نئے قالب میں ڈھل رہا ہے بشر

یہ علم وہ ہے جو ہے نوزنیتوں کی اک زینت
یہ علم وہ ہے جو ہے نوزیوروں کا اک زیور

بڑھی ہے علم سے قوموں کی عقل و استعداد
ہوئی ہے غور سے اور فکر سے وسیع نظر

غرض ہے یہ شہِ آصف کی علم کا ہو شیوع
بنائے قوتِ ذہنی کو ہر طرح بہتر

شکستِ رنگِ جہالت سے تیرگی مٹ جائے
ریاضیات کے پرتو سے ذہن ہو روشن
دکن میں جامعِ عثمانیہ وہ قایم ہو
زبانِ ملک کو ہوں وہ ترقیاں حاصل
دماغِ قوم ہو روشن شعاعِ علمی سے
وہی علوم دکن میں ہوں جاری و ساری

اِدھر اُدھر ہوں فروزاں چراغِ علم و ہنر
الٰہیات کے جلوے سے قلب ہو انور
دکن ہو مصر یہ جامع ہو جامعِ ازہر
رہیں خزینۂ اُردو میں خوشنما گوہر
بنیں مفید کتابیں غذائے روحِ بشر
کسی زمانے میں یونان جن کا تھا مظہر

یہ مدّعا ہے وہی مدّعا جو ہے خوش کن
یہ آرزو ہے وہی آرزو جو ہے خوشتر

(۲۴۲) مناظرِ دولت آباد

ہے صبا سرگرمِ شوخی مست موجِ آبشار
منظرِ فطرت فلک منزل پہاڑوں کی فضا
دفترِ قدرت کا مجموعہ ہے یا پھولوں کے ورق
برف بھی اُس کی سپیدی سے ہوئی ہے آب آب
کوکتے ہیں ہر طرف صحرا میں طاؤسانِ مست
پرفشانی سے عیاں ہے جلوۂ بالِ پری
کیجیے آزاد ہو کر اک نئی ہستی کی سیر

لڑکھڑاتے جس طرح نشّہ میں کوئی نازنیں
سنگ ریزے گھاٹیوں کے ہیں کہ ہیں دُرِّ ثمیں
اور کوسوں تک پہاڑ ڈھانکی ہے سبزے نے زمیں
گھاٹ کی دیوار مضبوطی میں ہے کوہِ آہنیں
رہ نوردوں کو لبھاتی ہے نوائے دلنشیں
ہر طرف پرواز میں مصروف مرغِ دانہ چیں
دل یہ کہتا ہے یہیں رہ جائیے خلوت گزیں

دو پہاڑوں کی ہم آغوشی ہے کتنی دلربا	حوضِ قتلو بھی یہیں ہے اور درّہ بھی یہیں

(۲۲۳) خلد آباد میں غارِ ایلورہ

غارِ ایلورہ عجب شے ہے دکن کے ملک میں	جس کی صنعت پر تصدق ہے نگارستانِ چیں
عہدِ گوتم کے صنم خانے بنے ہیں زیرِ کوہ	دستکاری دیکھ کر حیران ہیں نظارہ بیں
ایک جانب موجزن ہے آبشارِ خوش نما	ہے وہ سو گز کی بلندی سے رواں سوئے زمیں
دیکھنے والی نظر کو ہو رہا ہے یہ گماں	سطحِ ارضی پر ہے بہتا چشمۂ خلدِ بریں
بت تراشی کے نمونے گھاٹیوں کی تہ میں ہیں	صنعتِ مغرب بھی ہے ان کے مقابل شرمگیں
کہہ رہی ہیں غار کی سنگیں عماراتِ عجیب	کیا ہوئی وہ شان و شوکت کیا ہوئے اپنے مکیں

(۹۲) احسن سنہ ۱۸۷۵ء

احسن سید حافظ علی احسن خلف حاجی سید محبت نبی حسن مرحوم قصبۂ مارہرہ ضلع ایٹہ کے پیرزادوں میں ہیں۔ شوال ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ کم سنی سے شاعری کا شوق ہے۔ حضرت داغ کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ فارسی میں خاص مہارت ہے عربی میں بھی دخل ہے۔ رسالہ فصیح الملک آپ کی ادارت میں جاری تھا۔ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرر ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:-

غزل (۲۴۳)

دُنیا کا بھروسہ نہ سہارا نہ مجھے دیں کا / اِس عشق بد انجام نے رکھا نہ کہیں کا

قسمت میں جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا / لکھا ہوا مٹتا ہے کہیں لوحِ جبیں کا

تم نالۂ مظلوم کو بے کار نہ سمجھو / پایا نہ ہلا دے وہ کہیں عرشِ بریں کا

ایسوں کو ستانا نہیں اچھا نہیں اچھا / لے صبر نہ اے چرخ کسی گوشہ نشیں کا

احسن کی تسلی تو ذرا کیجیے آ کر! / اب آ ہی گیا وقت دمِ باز پسیں کا

(۲۴۴)

بنی ہے دم پہ تو ایسا خیال ہوتا ہے / وگرنہ ترکِ تعلق محال ہوتا ہے

جما ہوا ہے تصور کچھ اس طرح دل میں / کہ خواب میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے

عتاب میں نہیں رہتی نقاب چہرے پر / عیاں جلال میں اُن کا جمال ہوتا ہے

صفِ نیاز میں رہتا ہے سر بلند وہی / تمھارے ہاتھ سے جو پائمال ہوتا ہے

ترے ستم پہ یہ ہوتا ہے دل کہ قطع کروں / مگر پھر اپنے کیے کا خیال ہوتا ہے

اُمیدِ صلح نہ رکھ بد مزاج سے احسن / کہ اس سے میل کے بدلے ملال ہوتا ہے

(۲۴۵)

سنگِ در بن کر بھی کیا حسرت مرے دل میں نہیں / تیرے قدموں میں ہوں لیکن تیری محفل میں نہیں

اُن کی بزمِ ناز کیا ہی عالمِ تصویر ہی
ہی یہ خاموشی کہ گویا کوئی محفل میں نہیں

راہِ اُلفت کا نشاں یہ ہی کہ ہو وہ بے نشاں
جادہ کیسا نقشِ پا تک کوئی منزل میں نہیں

بزم آرائی سے پہلے دیکھ لو او نادان دیکھ!
کون ہی محفل میں تیری کون محفل میں نہیں

رہ کے زنداں میں کریں گے ہم کھلے بندوں فغاں
پاؤں ہی زنجیر میں لب تو سلاسل میں نہیں

ہو چکی مشقِ ستم بس بس او ستم ایجاد بس!
اُٹھ بیٹھنے کی سکت بھی تیرے بسمل میں نہیں

پوچھتا ہی آرزوئے حسن کی تو کیا بار بار
تیرے ملنے کے سوا کوئی ہوس دل میں نہیں

(۹۳) حسرت ۱۸۷۵ء

حسرت مولانا فضل الحسن خلف سید اظہر حسن صاحب. موہان ضلع اوناؤ کے باشندے ہیں. سال پیدایش تقریباً ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۳ھ ہی. ۱۹۰۳ء میں علیگڑھ کالج سے بی.اے کی ڈگری حاصل کی زمانۂ طالب علمی سے سخن گوئی کا شوق ہی. تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں. ان کا شمار پُرگو شعرا میں ہی. اردوئے معلےٰ نامی ماہوار رسالہ کے ذریعے عرصہ تک زبان اُردو کی خدمت کی. چار دیوان شایع ہو چکے ہیں. دیوان غالب اُردو کی شرح بھی لکھی ہی. ایک تذکرۃ الشعرا لکھنا شروع کیا تھا جس کے صرف چند حصے شایع ہو کر رہ گئے عرصے سے اُن کے ادبی شوق پر سیاسی خیالات غالب ہیں اس وقت تک ان کا دیوان دس حصوں میں

شائع ہو چکا ہے) نمونہ کلام یہ ہے:-

(۲۴۶) غزل [له]

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دل بس کہ ہے دیوانہ اُس حسنِ گلابی کا
رنگیں ہے اسی رو سے شاید غمِ فرقت بھی

خود عشق کی بیباکی سب تجھ کو سکھا لے گی
ہے حسن حیا پرور، شوخی بھی شرارت بھی

رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمتِ بیتابی
یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں ہو قوت بھی

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

(۲۴۷)

ہوائے یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

ترے روئے دل آرا کے تصور کا یہ عالم تھا
کہ چشمِ شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے

مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے

[له] یہ غزل بہ حالت قید سنہ ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی تھی۔ ۱۲

طریقِ عشقِ جاناں ہی جُدا گبر و مسلماں کا
یہیں سے اختلافِ سبحہ و زنّار پیدا ہی

نگاہِ آرزو گلچینِ باغِ کامرانی ہی
بسانِ خواب شکلِ طالعِ بیدار پیدا ہی

وفا میری بہ شکلِ بے زبانی آشکارا تھی
ستم تیرا بہ رنگِ پرستشِ اغیار پیدا ہی

نسیمِ دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرت
تجھی سے ہی کہ یہ نیرنگیِ گفتار پیدا ہی

(۹۴) فانی سنہ ۱۸۷۹ء

مولوی شوکت علی خاں بی اے ایل ایل بی بدایونی۔ پیدایش سنہ ۱۲۹۶ھ مطابق سنہ ۱۸۷۹ء بریلی کالج کے گریجویٹ ہیں سنہ ۱۹۰۱ء میں علیگڈھ کالج سے ایل ایل بی ہوئے کئی سال تک لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے آج کل بریلی میں قیام ہی۔ آپ کا کلام علیگڈھ کالج میگزین اور دیگر ماہوار رسالوں میں اکثر چھپتا ہی۔ ایک مختصر دیوان شایع ہو چکا ہی اب حیدرآباد دکن میں انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں ان کا دیوان کچھ غزلوں کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ بھی شایع ہو چکا ہی۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہی:۔

(۲۴۸)

مری میت پہ اُن کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے
مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
مری محرومیوں کا فیض جاری ہر رگ و پے میں
غبارِ اشک خارستانِ حسرت بن گئے منظر
نظر آئے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بیتابی
شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں

دلِ بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارا ہے بہہ جائے تو دریا ہے
بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنا ہے
ہمارے دل کی دنیا بھی کوئی دنیا میں دنیا ہے
ہم اے امید سمجھے ہیں کچھ تیرا اشارا ہے
جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

(۹۴) چکبست ۱۸۸۲ء – ۱۹۲۶ء

چکبست[۱] برج نرائن کشمیری پنڈت ہیں سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء میں مقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ ہے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں بی۔ اے پاس کرکے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں۔ شاعری میں حضرت افضل سے تلمذ ہے رنگ قدیم و جدید دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں ناظم و ناثر ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے سنہ ۱۹۱۸ء میں شایع ہوا ہے۔ آج کل ایک اردو رسالہ "صبح امید"

۱؎ افسوس کہ قبل طبع ثانی تذکرہ ہذا چکبست صاحب کا بتاریخ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۲۶ء انتقال ہو گیا۔

لکھنؤ سے نکالتے ہیں۔

(۲۴۹) غزل

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

وہ طبعِ یاس پرور نے مجھے چشمِ حقیقت دی
کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

(۲۵۰) راماین کا ایک سین

رخصت ہوا وہ[۱] باپ سے لیکر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

آخر ہے کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال

دیکھا تو ایک در میں وہ بیٹھی ہے خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

ا۔ وہ کا اشارہ رامچندر جی کی طرف ہے ۱۲

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم

ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت کا غم
میں خوش ہوں جو بھی تک نہ دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن مصیبتوں میں گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب آئے ہی میرے نونہال
لائے دلہن جو بیاہ کے شادی ہوئی کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آساں مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ درد خیز
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغِ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جاں سے یہ بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور | مایوس کیوں ہیں آپ یہ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور | لیکن نہ دل سے کیجیئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جبل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر | ہوتا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسبابِ ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر | کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار | واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار | ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب | جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ درونِ دل سے قلب و جگر ہو گئے خراب | پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے

وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
اِن بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم اُمید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
لیکن جو رنگِ باغ بدلتا ہے ناگہاں
ہر دن کی دھوپ رات کی شبنم اٹھیں گراں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بےشمار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
موقوف کچھ ریاض پہ اُن کی نہیں بہار
وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بےخبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

(۹۶) عزیز ۱۸۹۲ء

عزیز۔ مرزا محمد ہادی۔ ابن مرزا محمد علی صاحب شرفا لکھنؤ سے ہیں ۲۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی میں ذی استعداد ہیں

امین آباد ہائی اسکول میں مدرس ہیں۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام حقیقی جذبات کا معیار ہے۔ علاوہ اور تصانیف کے دیوان اُردو "گل کدہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ افسوس کہ سنہ ۱۳۵۲ھ میں انتقال ہو گیا۔ نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

غزل (۲۵۱)

ذرّۂ خاک میں اک عالمِ پنہاں نکلا
دل بھر آیا جو سوئے گورِ غریباں نکلا

قبر تک لاش گئی ساتھ ہوا اک عالم
یوں رہا ہو کے ترا قیدیِ زنداں نکلا

ہاتھ بڑھتا تھا کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا
پھر وہی مرحلۂ چاکِ گریباں نکلا

روح اس پیکرِ تعمیر کی تھی ویرانی
ذرّے ذرّے میں مرے گھر کے بیاباں نکلا

پردۂ گل سے ہوا فاش جنوں کا پردہ
کون محفل سے تری چاکِ گریباں نکلا

آہ! وہ دل کہ جو تھا معتکفِ استغنا
کوچۂ یار میں منت کشِ درباں نکلا

خودکشی سے بھی ہوئی کار برآری نہ عزیزؔ
سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا

(۲۵۲)

حقیقت میں جو سیرِ عالمِ ایجاد کرتے ہیں
وہ ہر ذرّے میں اک دنیا نئی آباد کرتے ہیں

ہمارے ضبط میں پنہاں ہے نظم عالم ہستی
نہ ہو تم کو یقیں اس کا تو ہم فریاد کرتے ہیں
کوئی دُنیا کی قوت اب مٹا سکتی نہیں تجھ کو
زمینِ دل تجھے ہم اس طرح آباد کرتے ہیں
نہ پوچھ اے عشقِ پُر مایہ حقیقت اُن کی ہستی کی
جو اپنے ساتھ اس دُنیا کو بھی آزاد کرتے ہیں
نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے
اسیرانِ محبّت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں
بس اب اے روح جلدی اپنے مرکز کی طرف پھر جا
فقط تھا انتظار اس کا وہ کیا ارشاد کرتے ہیں

عدم کے قافلے ہم کو خبر دیتے ہیں آ آ کے
عزیزانِ وطن تم کو عزیزاں یاد کرتے ہیں

(۹۷) مزاج سنہ ۱۸۸۲ء

سیّدنا راحمد والد کا نام سید قاسم علی پیدائش دوم ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء سیّدنا امام جعفر صادق علیہ السّلام کی اولاد سے ہیں بزرگوار سے

ہندوستان آئے۔ اس لیے جعفری سبزواری کہلاتے ہیں۔ شاہجہاں بادشاہ دہلی کو ان کے مورث سید شاہ احمد سے نہایت عقیدت تھی ۱۷ مواضع بطور جاگیر معافی عطا ہوئے اس میں ایک موضع ٹھڈلی تحصیل کاسگنج میں اب بھی ان کے خاندان میں باقی ہے۔ اردو میں مزاج فارسی میں احمدی تخلص کرتے ہیں دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں حضرت داغ دہلوی سے تلمذ ہے۔ عاشقانہ رنگ کے علاوہ قومی نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ وطن علی گڈھ ہے اس وقت سرکار آصفیہ میں بیدر کے تعلقدار اول ہیں۔

(۲۵۴)

خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں ہے ۔۔۔ نہیں کو مگر چشمِ بینا نہیں ہے
مجھے قبر میں کوئی کھٹکا نہیں ہے ۔۔۔ کہ یاں جینے مرنے کا جھگڑا نہیں ہے
یہاں عرضِ مطلب کا یارا نہیں ہے ۔۔۔ انھیں بات سننی گوارا نہیں ہے
کبھی جو نہ نکلے وہ حسرت ہے میری ۔۔۔ جو بر آئے میری تمنا نہیں ہے
تجھے لے کے ہم کیا کریں بادشاہی ۔۔۔ ہمیں کو جو دنیا میں رہنا نہیں ہے
کہاں حسنِ صورت کہاں حسنِ معنی ۔۔۔ مصوّر یہ نقشہ وہ نقشا نہیں ہے
مرا درد میری دوا بن چکا ہے ۔۔۔ مجھے احتیاجِ مسیحا نہیں ہے
پڑی میکدے پر یہ کیا اوس ساقی ۔۔۔ کہ برسوں ہوئے دورِ صہبا نہیں ہے
یہ بے تابیاں رنگ لا کر رہیں گی ۔۔۔ مزاج اس کا انجام اچھا نہیں ہے

۲۵۴

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
اب راہِ مغفرت رہِ میخانہ ہو گئی

پھر چھیڑ کیا یہ اے دلِ دیوانہ ہو گئی
وہ آشنا نگاہ بھی بیگانہ ہو گئی

پھر مائلِ ظہور ہوا حسنِ خود پسند
پھر رسم و راہِ آئنہ و شانہ ہو گئی

غمزے کس نے جھانک کے ہنگامہ کر دیا
کل کائنات بزمِ حریفانہ ہو گئی

ساقی کو دیکھتے ہی خمِ مے پہ گر پڑا
زاہد سے بھی یہ حرکتِ رندانہ ہو گئی

جو بات دل سے تا بلب آئی نہ تھی کبھی
مجبوریوں سے دل کی وہ افسانہ ہو گئی

اب دل کہاں کہاں خلشِ خارِ آرزو
جاں ہی فدائے جلوۂ جانانہ ہو گئی

ذرّے بھی خاک کے انھیں اب جانتے نہیں
کسریٰ کی کیا وہ شوکتِ شاہانہ ہو گئی

وحشت نے کھو دیا اثرِ ہائے ہو مزاج
آہِ رسا بھی نعرۂ مستانہ ہو گئی

(۲۵۵)

مری بندگی نے بتا دیا کہ یہ راز ہی ترے ناز میں
ترا ساز ہی مرے سوز میں مرا سوز ہی ترے ساز میں

نہ اُلجھ اُلجھ کے تو چل صبا کہیں کھل نہ جائے وہ بل صبا
کہ ہزار دل ہیں بندھے ہوئے خم و پیچِ زلفِ دراز میں

کہیں طی ہوں زیست کے مرحلے مجھے مرکے آبِ بقا ملے
کہ غبار بن کے اُڑا کرے مری خاک راہِ حجاز میں

وہی نار ہے وہی نور ہے۔ وہی جلوہ گاہِ ظہور ہے
وہی شعلۂ سر طور ہے جو نہاں ہے پردۂ راز میں

یہ جہان ابلہ فریب ہے نہ فراز ہے نہ نشیب ہے
وہی پستیاں ہیں نشیب کی جو بلندیاں ہیں فراز میں

کبھی پردہ در ہوں جلال کا کبھی پردہ دارِ جمال ہوں
ہیں نہاں ہزار حقیقتیں مرے ایک رنگِ مجاز میں

(۹۸) لطف ۱۸۸۲ء

نواب لطف الدولہ بہادر نبیرۂ نواب خورشید جاہ بہادر پیدائش سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء اس وقت سرکار آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں صیغۂ تعمیرات کے وزیر ہیں۔ نعت اور حمد میں طبع آزمائی فرماتے ہیں نہایت صاف ستھرا اور نکھرا ہوا کلام ہے ملاحظہ ہو

ہے نورِ الٰہی کی جلوہ فگنی تم سے
کونین منور ہے ماہِ مدنی تم سے

ہے باغِ دو عالم کی تم سے چمن آرائی	پہونچی ہے گلوں کو بھی گل پیرہنی تم سے
ہر شے سے ہویدا ہے ہو جلوۂ گل	یہ گلشنِ عالم ہے سرو چمنی تم سے
لولاک لما والے جو کچھ ہو تمھیں تم ہو	اعیان ہوئے ثابت سب خلق نبی تم سے
مقبول کلام ایسا ہو طائرِ سدرہ کا	سیکھی ہے مگر اس نے شیریں سخنی تم سے
کہتا ہوں غنی کر دو دیدار کی دولت سے	کس چیز کا طالب ہوں اللہ غنی تم سے

جو نسبت روحانی شیخ قرنی کو تھی
طالب کو آئی کا یہ لطفِ دنی تم سے

(۲۵۷)

اذیتیں دل کو سب پہونچیں بتوں سے کیا ایک جہاں سے ہم کو
شکایت اپنے نصیب کی ہے گلہ نہیں آسماں سے ہم کو
نہ قول و عہد و قسم سے مطلب غرض نہیں ہے نہ ہاں سے ہم کو
کلام سننا ہے آج کوئی زبانِ معجز بیاں سے ہم کو
سنائیں کیا حالِ دل انھیں ہم چھپائیں کیا حالِ دل کو ان سے
سکوت سے فائدہ نہ کوئی نہ کچھ ہے حاصل بیاں سے ہم کو
یہ صاف معلوم ہو رہا ہے عدو سے ملنا غلط نہیں ہے
تمھارے انداز گفتگو سے تمھارے طرزِ بیاں سے ہم کو

بھلے ہی غیر ہم نے مانا بھلا کہو تم بلا سے اُن کو
بُرے ہی ہم مگر نہ بولو بُرا تم اپنی زباں سے ہم کو

ٹھنی ہے دل میں کریں گے سودا کسی کی لغزش سے دل کو دے کر
نہ فائدہ ہے کوئی خوشی ہے نہ رنج ہے کچھ زیاں سے ہم کو

وہ جانے والے ہیں غیر کے گھر نہ ذکر اے شورِ نالۂ دل
جگانا ہے فتنۂ قیامت کو آج خوابِ گراں سے ہم کو

وفا شعاری و جاں نثاری یہی ہے طرز و روش ہماری
تمہاری چالیں عدو کی گھاتیں بھلا یہ آئیں کہاں سے ہم کو

کبھی ہے کل اور کبھی ہے پرسوں کرو گے حیلے بہانے کب تک
تمہارے دل میں نہیں جو آنا تو صاف کہہ دو زباں سے ہم کو

ازل سے ہے سجدہ گہ ہماری ہمیں گزاریں گے عمر ساری
مٹا دو خطِ جبیں کو پہلے اٹھا دو پھر آستاں سے ہم کو

انھیں کا ہی نام حضرتِ لطف ہی تو مشہور ہو رہا ہیں
دکھائی دیتے ہیں میکدہ میں خموش کے جو درمیاں سے ہم کو

(۹۹) اثر ۱۸۸۵ء

اثر۔ مرزا جعفر علی خاں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۲ھ تاریخ ولادت۔ لکھنؤ مولد اور وطن ہی۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں صوبہ متحدہ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ آج کل اوناؤ میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اساتذہ اردو کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہی جس کی جھلک ان کی غزلوں میں پائی جاتی ہی بعض انگریزی نظموں کے ترجمے نظم میں لکھے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "اثرستان" کے نام سے حال میں شائع ہوا ہی عزیز لکھنوی سے تلمذ ہی۔ نمونہ کلام یہ ہی۔

(۲۵۸) غزل

یاد ایّام کہ جب غم سے سروکار نہ تھا
پھول ہی پھول تھے دامن میں کوئی خار نہ تھا

عالمِ حُسن کے جلوے تھے مری نظروں میں
جنسِ الفت کا سوا میرے خریدار نہ تھا

کیسی راحت میں شب و روز بسر ہوتے تھے
شعلۂ آہ نہ تھا دیدۂ خونبار نہ تھا

محوِ نظارہ تھا عشرت کدۂ ناز میں دل
واقفِ درد نہ تھا خوگرِ آزار نہ تھا

شوق آغوشِ تمنّا میں تھپکتا تھا مجھے
نفسِ سرد نہ تھا اشکِ شرربار نہ تھا

آئینہ خانۂ دل میں تھا وہی جلوہ فروش
عشقِ خود کام کو اندیشۂ اغیار نہ تھا

پردہ دارِ ہوش نہ تھے عقل خبردار نہ تھی
عشق اک راز تھا گنجینۂ دل میں پنہاں
نغمۂ شوق سے لبریز تھا ہر تارِ نفس
بڑھتے بڑھتے جو ہوا جذبۂ الفت کامل
ٹھوکریں کھائیں زمانے کی مصیبت جھیلی
دفعتاً دیدۂ دل وا ہوئے چمکا اک نور
بجلیاں ٹوٹ پڑیں عشق پہ مجھے غش آیا
آخرِ کار ہوا رہبرِ دل ذوقِ فنا

لاکھ اسرار تھے دل محرمِ اسرار نہ تھا
غمِ ہستی سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا
کون سا لطف تھا دل جس کا سزاوار نہ تھا
دستِ وحشت سے گریباں میں کوئی تار نہ تھا
کون آزار تھا میں جس میں گرفتار نہ تھا
وہ سماں دیکھا کہ جس کے لئے تیار نہ تھا
آنکھ کھلتے ہی دو عالم سے سروکار نہ تھا
بند آنکھیں تھیں مگر خوابِ گراں بار نہ تھا

رنج پرور یہ صدا آتی تھی کانوں میں اثر
ڈھونڈنے والے کو ملنا مرا دشوار نہ تھا

(۲۵۹)

عقل ہے دنگ اے کریم نیر اشعار دیکھ کر
بخش دیجے مرے گناہ اُن کا شمار دیکھ کر
ساقی و بزمِ مے نہیں مطرب چنگ و نے نہیں
روؤں نہ زار زار کیوں ابرِ بہار دیکھ کر

مرنے کے بعد بھی ذرا چین نہ قبر میں ملا
اُس نے مجھے جگا دیا سوئے مزار دیکھ کر

چاک ہوئی قبائے گل بادِ سحر کی چھیڑ سے
مست ہر ایک نخل ہے جوشِ بہار دیکھ کر

ہم نہیں رجا نہیں، رشک نہیں فغاں نہیں
پھر گیا دل بہشت سے کوچۂ یار دیکھ کر

شورشِ دل نے ہے اثر کیا کہوں، کیا مزا دیا
اس نے نمک چھڑک دیا سینہ فگار دیکھ کر

(تمام شد)

فہرست شعراء

اس فہرست میں ہر شاعر کو بہ ترتیب حروف ہجی درج کیا گیا ہے اور نمبر صفحہ جس پر اس شاعر کا کلام ملتا ہے اس کے محاذ میں لکھا گیا ہے